خصوصی نمبر

مولانا امین احسن اصلاحی کی یاد میں

# تدبّر

لاہور

جاری کردہ :

مولانا امین احسن اصلاحی

مُدیر:

خالد مسعود

یکے از مطبوعات

اِدارۂ تدبّرِ قرآن و حدیث

لاہور۔ پاکستان

جاری کردہ:

**مولانا امین احسن اصلاحی**

مدیر:

**خالد مسعود**

# تدبر لاہور

شمارہ نمبر 60

اپریل 1998ء

محرم الحرام 1419ھ

## فہرست


**تذکرہ و تبصرہ**

| | | |
|---|---|---|
| تدبر کا اصلاحی نمبر | خالد مسعود | 3 |

**مقالات**

| | | |
|---|---|---|
| حکمت قرآن کا شارح | ضیاء الدین اصلاحی | 6 |
| جامع کمالات شخصیت | ڈاکٹر ظفر الاسلام اصلاحی | 16 |
| فکر قرآنی کا رازداں | سلیم کیانی | 24 |
| دیدۂ بینا | محبوب سبحانی | 31 |
| تذکرہ و تبصرہ | مولانا امین احسن اصلاحی | 39 |
| مولانا اختر احسن اصلاحی مرحوم | امین احسن اصلاحی | 42 |
| سقراط اور مولانا اصلاحی | ڈاکٹر منصور الحمید | 44 |

**انٹرویوز**

| | | |
|---|---|---|
| جماعت اسلامی سے وصل و فصل کے اسباب | ڈاکٹر منصور الحمید | 45 |
| صاحب تدبر۔ چند خاطرات | زاہد منیر عامر | 59 |
| مولانا اصلاحی سے چند باتیں | ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی | 74 |
| ڈائری کے چند اوراق | عبدالرزاق | 76 |


(صفحہ 2 پر)

مجلسِ ادارت

**عبداللہ غلام احمد**

**ماجد خاور**

**محبوب سبحانی**

**سعید احمد**

قیمت: ۲۰/- روپے

سالانہ: ۲۴۰/- روپے

بیرون ملک: ۱۲۰۰/- روپے

ناشر: ادارہ تدبر قرآن وحدیث رحمان سٹریٹ، مسلم کالونی، سمن آباد لاہور

مطبع: المطبعۃ العربیۃ لاہور

نئی اشاعت

امام حمید الدین فراہی علیہ الرحمۃ کی مندرجہ ذیل تالیف مطالعہ فرمائیے

حکمت قرآن

موضوعات

امام فراہیؒ کا تصور حکمت

حکمت کی اصل اور اس کی فروع

حکمت اور قرآن حکیم

دین اسلام کا نظام

دین اسلام کی بنیادیں

حکمت کا مفہوم

حکمت کی تعلیم اور اس کا حصول

حکیم کا طرز فکر و تعلیم

مذاہب پر غور کا طریقہ

ترجمہ = خالد مسعود

قیمت = -/84 روپے

فاران فاؤنڈیشن

122 - فیروز پور روڈ - اچھرہ لاہور 54600

فون = 7595200

اسباق النحو

مصنف :- خالد مسعود

- امام فراہیؒ کی کتاب پر مبنی نئی ترتیب کے ساتھ
- عربی زبان کے قواعد کی تعلیم کا جدید انداز
- اسم، فعل اور حرف کا ضروری تعارف

## تاثرات


| | | |
|---|---|---|
| نابغۂ روزگار محقق | جسٹس (ر) محمد افضل چیمہ | 80 |
| ہمہ صفت شخصیت | ڈاکٹر ابو سفیان اصلاحی | 86 |
| بیدار مغز عالم دین | عبدالرشید عراقی | 89 |
| متوازن و معتدل عالم | عبدالحمید برایشیق | 91 |
| بحرِ زخار کا غواص | عبدالخالق فاروقی | 93 |
| شفیق استاذ | محمود احمد لودھی | 96 |
| بیاد مولانا امین احسن اصلاحی | سید شبیر بخاری | 98 |


## مکاتیب قارئین


| | | |
|---|---|---|
| بعض وضاحتیں | منصور الحمید' خوشی محمد<br>میاں طفیل محمد | 99 |
| روداد تعزیتی اجلاس | مدرسۃ الاصلاح' | 106 |
| | ادارہ علوم القرآن | 107 |
| اشاریہ مضامین تدبر | سید اسحاق علی | 110 |




تذکرہ و تبصرہ

خالد مسعود

# تدبر کا اصلاحی نمبر

تدبر کے پچھلے شمارے میں استاذ مرحوم مولانا امین احسن اصلاحی رحمۃ اللہ علیہ کے تذکرہ میں قارئین کرام سے درخواست کی گئی تھی کہ وہ مولانا کی شخصیت اور خدمات دینی کے بارے میں اگر کچھ لکھیں' نیز ان کے پاس اگر مولانا کے علمی نوعیت کے مکاتیب محفوظ ہوں' تو ان کی تحریریں اور یہ مکاتیب چھاپنے کے لیے تدبر کے صفحات حاضر ہیں۔ ادارہ کی خواہش ہوگی کہ وہ اس عظیم سرمایہ علمی کو محفوظ کر دے۔ الحمد للہ کہ اس اپیل کا خاطر خواہ ردعمل سامنے آیا۔ مولانا کے شاگردوں اور عقیدت مندوں' نیز فکر فراہی" کے حاملین نے اپنے مضامین میں مولانا کی خدمات کا جائزہ لیا' اور بہت سے مکاتیب کی نقول مہیا کی ہیں۔ ادارہ اس تعاون پر تمام احباب کا شکرگزار ہے اور متمنی ہے کہ وہ آئندہ بھی مولانا کے فکر کی ترویج میں اسی طرح اپنا تعاون پیش فرماتے رہیں گے۔

سابقہ روایات سے ہٹ کر تدبر کا زیر نظر شمارہ صرف مولانا امین احسن اصلاحی رحمۃ اللہ علیہ سے متعلق مضامین و تذکروں پر مشتمل ہے۔ اس لحاظ سے اسے تدبر کا "اصلاحی نمبر" کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ خیال یہ تھا کہ مضامین اور مکاتیب ایک ہی شمارہ میں شامل کر دیے جائیں گے۔ لیکن تنہا مضامین ہی اس قدر تھے کہ رسالہ معمول کی دو اشاعتوں کی ضخامت سے بھی بڑھ گیا۔ لہٰذا اب یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ مولانا کے مکاتیب کو تدبر کی اگلی اشاعت پر اٹھا رکھا جائے۔

موصولہ مضامین نوعیت کے اعتبار سے الگ الگ ہیں۔ ان میں سے بعض میں تو مولانا مرحوم کی شخصیت کا احاطہ اور ان کی خدمت قرآن اور خدمت دین کو اجاگر کیا گیا ہے۔ بعض مضامین انٹرویو کی نوعیت کے ہیں جن میں سوال و جواب کی صورت میں مولانا سے کسی معاملہ میں ان کا نقطہ نظر معلوم کیا گیا۔ کچھ مضامین مولانا کی شخصیت کے کسی پہلو کو نمایاں کرتے ہیں۔ رسالہ کی ترتیب میں مضامین کی نوعیت کے اس فرق کو مدنظر رکھا گیا ہے۔

مضامین کے اس گلدستہ کو سجانے کے لیے جن قابل احترام شخصیات نے گل ہائے رنگا رنگ چنے ہیں' ان کا تعارف بے محل نہ ہوگا۔ مولانا مرحوم کی مادر علمی' مدرسۃ الاصلاح سرائے میر' سے فیض پائے ہوئے ادارے تعاون کرم فرما۔ مولانا ضیاء الدین اصلاحی' ڈاکٹر ظفر الاسلام اصلاحی اور ڈاکٹر ابو سفیان اصلاحی ادارے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کی شرکت گویا اصلاحی برادری کی نمائندگی ہے۔ مولانا ضیاء الدین موقر ماہنامہ معارف اعظم گڑھ کے مدیر ہیں۔ ڈاکٹر ظفر الاسلام علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ اسلامیات میں

ریڈر اور فکر فراہی پر کام کرنے والے ادارہ علوم القرآن کے روح رواں ہیں۔ ڈاکٹر ابوسفیان مسلم یونیورسٹی کے شعبہ عربی سے منسلک ہیں۔ یہ بھی ادارہ علوم القرآن علی گڑھ میں فعال کردار ادا کر رہے ہیں۔

بھارت کے علاوہ دوسرے ممالک سے بھی تین محترم احباب شریک ترتیب ہیں۔ جناب سلیم کیانی حلقہ تدبر قرآن سے مستفیض ہونے والوں میں سے ہیں۔ آج کل وہ سنٹر فار انٹرنیشنل پالیسی اسٹڈیز لندن سے وابستہ ہیں۔ مولانا سے فیض یاب ہونے کے بعد انہیں درس قرآن سے ہمیشہ شغف رہا ہے۔ انگریزی زبان پر اچھا عبور رکھتے ہیں اور مولانا کے شاگردوں میں سے ان کے اندر یہ استعداد ہے کہ تفسیر تدبر قرآن کو انگریزی کے قالب میں ڈھال سکیں اور اس طرح اس فکر کا دائرہ وسیع تر کر کے اسے دنیا کے کونے کونے میں پہنچا دیں۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ انہیں اس عظیم کام سے عمدہ برآ ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ جناب عبدالحمید برایشیق کا تعلق برادر ملک ترکیہ سے ہے۔ یہ ترکی کے موسسہ دینی' مرکز علوم اسلامیہ' استنبول کے شعبہ' تحقیق سے وابستہ ہیں۔ انہوں نے اردو پڑھنے' لکھنے اور بولنے کی استعداد بہم پہنچائی اور مولانا مرحوم سے تفسیر کے ترکی زبان میں ترجمہ کی اجازت حاصل کی۔ ڈاکٹر منصور الحمید' شاہ فیصل یونیورسٹی دمام' سعودی عرب سے منسلک ہیں۔ سقراط پر ایک کتاب کے مصنف ہیں اور فکر فراہی کی اشاعت میں بھرپور حصہ لیتے ہیں۔

باقی شرکائے محفل میں جناب محمد افضل چیمہ سپریم کورٹ آف پاکستان سے بحیثیت جسٹس ریٹائر ہوئے۔ مولانا مرحوم کے دوستوں میں سے ہیں۔ اپنی دو کتابوں کے انگریزی تراجم پر مولانا نے انہی سے پیش لفظ لکھوایا۔ جناب زاہد منیر عامر اورینٹل کالج لاہور کے شعبہ اردو سے وابستہ ہیں۔ جناب محمود احمد لودھی حلقہ تدبر قرآن سے فیض یافتہ ہیں۔ پاکستان آڈٹ اینڈ اکاؤنٹس سروس سے ریٹائر ہونے کے بعد آج کل انسٹی ٹیوٹ آف کاسٹ اینڈ مینجمنٹ اکاؤنٹینٹس کراچی کے ڈائرکٹر ہیں۔ جناب عبدالرشید عراقی معروف مضمون نگار ہیں۔ دینی شخصیات پر تحقیق ان کا خاص موضوع ہے۔ جناب عبدالخالق فاروقی گورنمنٹ البیرونی ڈگری کالج پنڈ دادن خان میں اسسٹنٹ پروفیسر ہیں۔ جناب عبدالرزاق کا شعبہ جغرافیہ ہے۔ مولانا اصلاحی کے فکر کے طالب علم ہیں۔

تدبر کے پچھلے شمارہ میں مولانا کا جو تذکرہ لکھا گیا تھا اس پر تین خطوط بھی موصول ہوئے۔ ان کی اہمیت کے پیش نظر انہیں بھی اس شمارہ میں جگہ دی گئی ہے۔ محترم میاں طفیل محمد' سابق امیر جماعت اسلامی' نے جماعت میں مولانا کے داخل ہونے اور سترہ سال بعد اس سے الگ ہونے کی روایت پر کچھ سوالات اٹھائے۔ اتفاق سے ٹھیک انہی سوالوں پر مولانا مرحوم کا ایک انٹرویو جناب منصور الحمید صاحب نے فراہم کیا جو شامل اشاعت ہے۔ امید ہے کہ اس کی مدد سے مولانا کا نقطہ نظر سمجھنے میں کوئی دقت پیش نہیں



آئے گی۔ یہ انٹرویو راقم کی معلومات کے عین مطابق ہے۔ جماعت کے اجتماع ماچھی گوٹھ یا کوٹ شیر سنگھ میں منعقد ہونے والی مجلس شوریٰ میں کیا کارروائی ہوئی اور بعد میں مولانا کے ساتھ کس مسئلہ پر مذاکرات ہوتے رہے جن کی ناکامی پر مولانا نے بالآخر جماعت سے حتمی استعفیٰ دیا' راقم کی رسائی ان چیزوں تک نہیں۔ یہ چیزیں جماعت کے اس دور کے رہنماؤں کے علم کا حصہ ہیں۔ ہمیں غرض مولانا اصلاحی کے اپنے نقطہ نظر سے ہے اور راقم کے خیال میں اب وہ زیادہ منقح ہو کر سامنے آگیا ہے۔

جہاں تک حافظ سے تفاؤل کا سوال ہے یہ مولانا کے اعتقاد و عمل کا حصہ کبھی نہیں رہا اور نہ ہو سکتا تھا۔ اس کی نوعیت ایک علمی لطیفہ ہی کی ہے اور مولانا نے بھی اس کا تذکرہ اسی طور پر کیا۔ یہ ٹھیک ہے کہ اگر اس واقعہ کا تذکرہ نہ کیا جاتا جب بھی مضمون کی افادیت پر کوئی اثر نہ پڑتا۔

مولانا کی جلالت شان اور خدمات دینی کا یہ مختصر سا مرقع میرے نزدیک نہایت نامکمل ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے سرمایہ علمی پر پوری نظر ڈالنا اور پھر اس پر تبصرہ کرنا محدود وقت میں ممکن نہ تھا۔ یہ کام انشاء اللہ جاری رہے گا اور آئندہ شماروں میں اس کے دوسرے اہم پہلو بھی سامنے آتے رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ سے ہم حسن عمل کی توفیق کے طلب گار ہیں۔

---

ضیاء الدین اصلاحی

# حکمت قرآن کا شارح

۱۶ دسمبر ۱۹۹۷ء کو جامعۃ الفلاح بلریا گنج میں یہ اندوہ ناک خبر سنی کہ مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کی وفات ہو گئی۔ **انا للہ وانا الیہ راجعون**۔

ادھر سال بھر سے اس کا کھٹکا لگا ہوا تھا کہ علم و کمال کا یہ مہر جہاں تاب غروب ہونے والا ہے۔ اور قرآن و حدیث کے بحر کا شناور اور غواص' علامہ حمید الدین فراہیؒ کا جانشین و ترجمان' ان کے علوم و معارف کا وارث و امین' حکمت قرآنی کا شارح و مبین' دین حق کا داعی و مبلغ' اسرار دین کا عارف و آشنا' شرک و توحید اور تقویٰ و نماز کا رمز و حقیقت شناس اپنے ہزاروں شاگردوں اور قدردانوں کو مغموم' اداس اور سوگوار چھوڑ کر جلد ہی سفر آخرت پر روانہ ہونے والا ہے۔

ابھی مولانا بدر الدین اصلاحی ناظم مدرسۃ الاصلاح و دائرۂ حمیدیہ کا غم تازہ ہی تھا کہ مدرسہ کا یہ گل سرسبد اور فکر حمید کا سب سے بڑا حامل و شیدائی بھی رخصت ہو گیا ؎

کیا کہوں تاریکی زندان غم اندھیر ہے
پنبہ نور صبح سے کم جس کے روزن میں نہیں

مولانا امین احسن اصلاحی صاحبؒ اعظم گڑھ شہر سے پورب میں واقع ایک گاؤں بمہور کے متوسط زمیندار گھرانے میں ۱۹۰۳ء میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد حافظ محمد مرتضیٰ صاحب ایک دیندار' متبع سنت اور تہجد گزار شخص تھے۔ وہ اپنے فرزند کو دینی تعلیم دلانا چاہتے تھے۔ اپنی اس تمنا کا ذکر انہوں نے اپنے ہم وطن دوست مولانا شبلی متکلم ندوی سے کیا جو علامہ شبلیؒ کے عزیز شاگرد اور مدرسۃ الاصلاح سرائے میر کے منصب اہتمام پر فائز تھے۔ انہوں نے اسی مدرسہ میں مولانا امین احسن صاحب کا داخلہ کرا دیا۔ جہاں انہوں نے ان سے اور دوسرے اساتذہ سے دینی علوم کی تحصیل کی۔ ان کو اپنی طالب علمی کے زمانے میں سب سے زیادہ فیض مولانا عبد الرحمٰن نگرامی ندوی سے پہنچا۔

مولانا عبد الرحمٰن نگرامی ندوی بڑے لائق و فاضل تھے۔ علامہ شبلی نے انہیں جوہر قابل سمجھ کر ان کی تربیت میں بڑی دلچسپی لی۔ وہ اپنے ساتھ انہیں بعض جلسوں میں لے جاتے۔ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر کے دوسرے سالانہ اجلاس میں بھی' جو ۱۹۱۰ء میں ہوا تھا' علامہ ان کو اپنے ہمراہ لائے' وہ اس وقت بہت کم عمر تھے۔ ایک بچہ کی زبان سے ایسے اچھے خیالات اور ایسی سنجیدہ تقریر سن کر لوگ حیرت میں پڑ گئے۔ یہی تقریر ندوہ سے فراغت کے بعد سرائے میر میں ان کے آنے کی تقریب بن گئی اور یہیں سے ان کی تدریسی



زندگی کا آغاز ہوا۔ مولانا سید سلیمان ندویؒ لکھتے ہیں:

> "تعلیم سے فارغ ہو کر مرحوم (مولانا نگرامی) بھی وابستگان شبلی کی جماعت میں داخل ہو گئے اور چار برس تک مدرسہ سرائے میر میں رہ کر درس و تدریس کا فرض انجام دیا۔ اور مدرسہ میں زیر تربیت چند اچھے لڑکے پیدا کیے۔ جن میں سے ایک آج مولانا امین احسن کے نام سے مشہور ہیں"۔ (یاد رفتگاں)

یہاں کے قیام کے زمانے میں انہوں نے مولانا حمید الدین فراہیؒ کے زیر سایہ قرآن پاک کا فیض حاصل کیا۔ اور مشرقی اضلاع میں ان کی اصلاحی تقریریں بھی مقبول ہو رہی تھیں۔ مگر جب مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم نے جامع مسجد کلکتہ میں مدرسہ اسلامیہ قائم کیا تو ان کی دعوت پر وہاں تشریف لے گئے۔ اس کے بند ہو جانے پر ۱۹۲۳ء میں ندوۃ العلماء لکھنؤ میں ادب و تفسیر کے استاد ہو کر آئے لیکن جلد ہی علالت کا سلسلہ شروع ہو گیا اور ۱۹۲۶ء میں عین شباب میں وفات ہو گئی۔

مولانا امین احسن اصلاحیؒ کو مولانا نگرامیؒ سے ایسا والہانہ تعلق تھا کہ "سچ" اخبار سے وابستگی کے زمانے میں وہ امین آباد سے روزانہ پیدل چل کر ندوہ ان سے ملنے جایا کرتے تھے۔ اس اخبار سے پہلے وہ "مدینہ" بجنور کے بھی ایڈیٹر رہے۔ مگر جلد ہی صحافت کا کوچہ چھوڑ دیا اور مدرسۃ الاصلاح کی کشش ان کو سرائے میر کھینچ لائی جس کے بوریائے فقر پر اس وقت ترجمان القرآن مولانا حمید الدین فراہیؒ فروکش ہو کر وہاں کے اساتذہ کو اپنے خاص نہج پر قرآن مجید کی تعلیم دے رہے تھے۔ ان کے درس سے انہوں نے اور ان کے ہم سبق مولانا اختر احسن اصلاحی مرحوم نے پورا استفادہ کیا۔ ان دونوں کا شوق و رغبت اور استعداد و قابلیت دیکھ کر مولانا فراہیؒ نے بھی ان کو اپنی توجہ و عنایت کا خاص مورد بنایا۔ مولانا سید سلیمان ندویؒ رقمطراز ہیں:

> "اواخر عمر میں مرحوم (مولانا فراہیؒ) کی سب سے بڑی کوشش یہ تھی کہ وہ چند مستعد طلبہ کو اپنے مذاق کے مطابق تیار کریں۔ چنانچہ کم از کم دو طالب علموں کی خاص طور سے انہوں نے دماغی تربیت کی"۔

مولانا امین احسن اصلاحیؒ کے فخر و امتیاز کے لیے یہ کافی ہے کہ انہیں مولانا فراہیؒ کی جانشینی کا شرف حاصل ہوا۔ اور وہی ان کے سب سے ممتاز شاگرد کی حیثیت سے مشہور ہوئے جس کا حق بھی انہوں نے خاطر خواہ طور پر ادا کیا۔ مولانا سید سلیمان ندویؒ کا بیان ہے کہ "بعض مستعد طلبہ نے مولانا فراہیؒ کے اس درس سے پورا فائدہ اٹھایا جن میں قابل ذکر مولوی امین احسن صاحب اصلاحی ہیں۔ ہماری آئندہ توقعات ان سے بہت کچھ وابستہ ہیں"۔

اپنے استاذ کا نام روشن کرنے اور ان کے افکار و نظریات کی اشاعت و ترجمانی کو انہوں نے اپنی

زندگی کا مشن بنا لیا۔ جب کسی جانب سے مولانا فراہیؒ پر کوئی اعتراض ہوتا تو وہ ان کی حمایت کے لیے سینہ سپر ہو جاتے۔ ان کے اس قسم کے مضامین "الاصلاح" اور معارف' دونوں میں چھپے ہیں۔ ایک زمانے میں ان کے استاد علامہ فراہیؒ اور استاذ الاستاذ علامہ شبلیؒ کے خلاف غوغائے تکفیر بپا ہوا تو وہی ان مظلوم "امامین ہمامین" کی مدافعت اور ان کی یادگار مدرسۃ الاصلاح کو شرپسندوں سے بچانے کے لیے یہ کہتے ہوئے آگے بڑھے ؎

بیا ورید گر ایں جا بود سخن دانے
غریب شہر سخن ہائے گفتنی دارد

مولانا امین احسن اصلاحیؒ قرآنیات اور عربی زبان و ادب ہی کے متبحر عالم نہ تھے' بلکہ اکثر دینی اور جدید علوم پر بھی ان کی اچھی اور مجتہدانہ نظر تھی۔ اپنے استاد علامہ فراہی سے قرآن مجید' ادب عربی اور نحو و بلاغت کے علاوہ فلسفہ جدیدہ کی بھی تحصیل کی تھی۔ ان کے والد بزرگوار سلفی المسلک اور مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوری' صاحب تحفۃ الاحوذی' کے عقیدت مند اور ان کی علم پرور مجلسوں کے حاضرباش تھے۔ والد کی خواہش پر مولانا اصلاحی نے فن حدیث کی امہات کتب از سرنو ان سے پڑھیں اور اس میں بڑا کمال حاصل کیا۔ وہ اپنے جن استادوں کا اکثر تذکرہ کرتے اور جن کے وہ بہت ممنون احسان تھے ان میں مولانا فراہیؒ اور مولانا گمراہیؒ کے ساتھ مولانا مبارک پوریؒ کا نام بھی لیتے۔

مولانا فراہیؒ کے انتقال کے بعد ان کے افکار و تصانیف کی اشاعت کے لیے مولانا امین احسن اصلاحیؒ کی سربراہی میں دائرہ حمیدیہ قائم ہوا جس نے مولانا کی عربی تصانیف کے متون اور ان کے سلیس و شگفتہ اردو ترجمے شائع کیے۔ یہ ترجمے مولانا اصلاحی نے اتنی خوبی اور قابلیت سے کیے ہیں کہ ان پر اصل کا دھوکہ ہوتا ہے۔ دائرہ حمیدیہ کی طرف سے ان کی ادارت میں ایک بلند پایہ علمی ماہنامہ "الاصلاح" بھی جاری ہوا۔ مگر ناقدری کی بنا پر یہ چار برس ہی میں بند ہو گیا۔ تاہم اس میں قرآنیات پر ایسے محققانہ مضامین شائع ہوئے کہ آج تک لب ساقی پر یہ مکرر صدا جاری ہے ع

کون ہوتا ہے حریف مے مرد افگن عشق

جس زمانے میں وہ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر میں درس و تدریس کی خدمت پر مامور رہ کر مولانا فراہیؒ کی تصنیفات کی ترتیب و اشاعت اور اپنی بعض کتابوں کی تحریر و تسوید میں مشغول تھے اسی زمانے میں ماہنامہ ترجمان القرآن کے دعوتی و انقلابی مضامین اور مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ کی موثر و دلنشین متکلمانہ تحریروں کا غلغلہ بلند ہوا جن سے جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے علاوہ وہ علماء بھی متاثر ہوئے جو وقت کے تقاضوں اور زمانے کے حالات سے کسی قدر باخبر تھے۔ لیکن مولانا امین احسن اصلاحی نے شروع میں ان کا کوئی اثر قبول نہیں کیا کیونکہ ان پر اس وقت تک اپنے استاد مولانا عبدالرحمٰن گمراہیؒ کے زیر اثر ترک



موالات' تحریک خلافت' مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کے سیاسی خیالات کا اثر تھا۔ اس کے علاوہ وہ خود جس فکر کے حامل تھے اس کے اپنے خاص تقاضے اور مطالبے تھے۔ اس کے ساتھ دوسرے افکار اور تحریکوں کا میل نہیں ہو سکتا تھا۔ اسی لیے غالباً وہ اس سے قریب نہیں ہو سکے۔ مولانا مودودیؒ کی کتاب "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش" پر الاصلاح کے کئی نمبروں میں تنقید لکھی۔

جب مولانا مودودیؒ نے اپنے خیالات کی اشاعت اور اپنا حلقہ اثر بڑھانے کے لیے بعض جگہوں کا سفر کیا تو وہ سرائے میر بھی تشریف لائے اور بالآخر فکر حمید کے سب سے بڑے داعی و شارح بھی ان کے مکمل ہم نوا ہو گئے۔ اور وہ وقت بھی آ پہنچا کہ استاد کا آستانہ چھوڑ کر پٹھان کوٹ' جو اس زمانے میں مولانا مودودیؒ کا مرکز و مستقر تھا' جا پہنچے۔ جب مدرسۃ الاصلاح کے حدود سے وہ باہر نکل رہے ہوں گے تو کارکنان قضا و قدر نے یہ صدا ضرور بلند کی ہو گی کہ "تیری شان ان مشاغل سے بالاتر ہے" ؎

اے تماشا گاہ عالم روئے تو
تو کجا بہر تماشا می روی

مگر ایسے جوش کے عالم میں ہوش کی باتوں پر کون کان دھرتا ہے۔ جلد ہی انہوں نے اپنی غیر معمولی صلاحیتوں سے مولانا مودودیؒ کے بعد جماعت میں اپنی سب سے اہم اور نمایاں جگہ بنالی۔ ترجمان القرآن پر نام تو مولانا مودودیؒ کا ہوتا تھا لیکن عملاً وہی اس کے مدیر ہو گئے تھے۔ اسی لیے جب ملک تقسیم ہوا تو جماعت کا نظام سنبھالنے اور اس کی امارت و سربراہی کا بار اٹھانے کے لیے مولانا مودودیؒ نے انہیں ہندوستان بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ اس سے بہرحال مدرسۃ الاصلاح میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ لیکن تقسیم کے بعد ایسی قیامت بپا ہوئی اور فسادات کی آگ اتنی سخت بھڑک اٹھی کہ جو جہاں تھا وہیں دم بخود رہ گیا۔ مولانا امین احسن صاحبؒ بھی لاہور سے سرائے میر کے خرابے میں چراغ آرزو جلانے تشریف نہیں لا سکے۔

پاکستان بننے کے بعد وہاں جماعت کی طرف سے اسلامی نظام کا مطالبہ بڑے زور و شور سے بلند ہوا۔ اس کی وجہ سے مولانا مودودی' مولانا اصلاحی اور دوسرے سرکردہ قائدین کو قید و بند کی صعوبتیں جھیلنی پڑیں۔ پھر انتخابات کا مرحلہ آیا جس میں جماعت نے پوری سرگرمی سے حصہ لینے کا فیصلہ کیا تو مولانا اصلاحی اور ان کے بعض رفقاء نے محسوس کیا کہ اب جماعت کی ساری توجہ حصول اقتدار کی جانب مرکوز ہو گئی ہے اور وہ اصلاح و دعوت اور افراد سازی کے اپنے اصل موقف سے منحرف ہو گئی ہے۔ بہرحال یہ اور اسی طرح کے بعض دوسرے اختلافات کی بناء پر وہ اس جماعت سے علیحدہ ہو گئے جس کے برسوں سے سب سے اہم اور برتر رکن تھے اور جس کے لیے اپنی ساری قوت و توانائی اور ذہنی و دماغی قابلیت و صلاحیت صرف کر دی تھی۔

جماعت سے علیحدگی کے بعد مولانا امین احسن صاحب نے حلقہ تدبر قرآن قائم کیا جس کی اطلاع جب

ان کے بعض قدیم کرم فرماؤں' مولانا عبد الباری ندوی اور مولانا عبد الماجد دریا بادی' وغیرہ کو ہوئی تو انہوں نے اس پر بڑی مسرت ظاہر کی۔ اس کے زیر اہتمام انہوں نے بعض ذی استعداد طلبہ اور جدید تعلیم یافتہ لوگوں کو قرآن مجید و احادیث نبوی' کا درس دینا شروع کیا۔ اور اپنے خیالات و مقاصد کے اظہار و اشاعت کے لیے رسالہ "میثاق" جاری کیا۔ بعد میں اس رسالے پر ان کے ایک شاگرد ڈاکٹر اسرار احمد قابض ہو گئے۔

جماعت سے الگ ہونے پر انہیں یک سوئی میسر ہو گئی تھی اس لیے وہ اپنے اصل اور بنیادی کام کی طرف متوجہ ہوئے اور قرآن مجید کی' جس میں برسوں سے غور و خوض ان کی زندگی کا سب سے محبوب مشغلہ تھا' تفسیر "تدبر قرآن" کے نام سے لکھنی شروع کی جو میثاق میں بالاقساط شائع ہوئی اور پھر نو جلدوں میں کتابی صورت میں چھپی۔ اردو میں یہ اپنی نوعیت کی منفرد تفسیر تھی اس لیے بہت مقبول ہوئی۔ پاکستان میں اس کے کئی ایڈیشن نکلے۔ اور ہندوستان میں بھی یہ تاج کمپنی دہلی سے چھپ گئی ہے اور ہر جگہ دستیاب ہے۔

مولانا حمید الدین فراہی" نے اواخر قرآن کی بعض مختصر سورتوں کی تفسیر لکھی تھی۔ باقی سورتوں کے متعلق کچھ نوٹ اور متفرق اشارات ہی لکھ سکے تھے۔ ضرورت تھی اور عرصہ سے مولانا فراہی" کے قدردانوں کا اصرار بھی تھا کہ ان کے اصول و متعینہ خطوط کے مطابق مکمل قرآن مجید کی تفسیر لکھی جائے۔ ظاہر ہے کہ یہ کام مولانا کے تلامذہ میں ان کے علاوہ کوئی اور نہیں کر سکتا تھا۔ انہوں نے یہ کام بڑی خوش اسلوبی سے کیا جو واقعتہ" ان کا بڑا کارنامہ اور ایں کار از تو آید و مرداں چنیں کنند کے مصداق ہے۔ مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی تحریر فرماتے ہیں:

> "ہمارے فاضل دوست مولانا امین احسن صاحب اصلاحی' ترجمان القرآن مولانا حمید الدین فراہی" کے ارشد تلامذہ میں ہیں۔ تفسیر کے درس و تعلیم میں انہوں نے تمام تر ان ہی سے استفادہ اور برسوں خود بھی اس پر غور و فکر کیا ہے۔ اس لیے ان کو تفسیر لکھنے کا حق تھا اور حق یہ ہے کہ انہوں نے اس کا پورا حق ادا کیا ہے۔ اور بڑی دقت و وسعت نظر اور ایمانی جذبہ سے یہ تفسیر لکھی گئی ہے جو ان کی برسوں کی محنت اور غور و فکر کا نتیجہ اور ہر حیثیت سے جامع و مکمل ہے---- اور مصنف کا بڑا کارنامہ ہے۔ اس سے اردو تفسیر کے ذخیرہ میں بیش بہا اضافہ ہوا اور وہ ہر پڑھے لکھے مسلمان کے مطالعہ کے لائق ہے"۔ (معارف عدد ۳ جلد ۱۰۴۔ ستمبر ۱۹۶۹ء)

یہ صحیح ہے کہ "تدبر قرآن" میں مولانا فراہی" کے اصول تفسیر مد نظر رکھے گئے ہیں اور اس میں ان کے افکار و خیالات سے مکمل استفادہ بھی کیا گیا ہے۔ اسی لیے اسے فراہی اسکول کی مستند تفسیر کا درجہ



حاصل ہو گیا ہے۔ مگر اصلاً یہ مولانا امین احسن اصلاحی کی ہی محنت و جانفشانی' برسوں کے مطالعہ و تحقیق اور مسلسل غور و فکر کا نتیجہ ہے۔ اور اس میں کہیں کہیں انہوں نے صراحتہ" اپنے استاذ سے اختلاف بھی کیا ہے۔

میثاق کے بعد ان کی نگرانی اور ان کے خاص فیض یافتہ جناب خالد مسعود صاحب کی ادارت میں رسالہ "تدبر" نکلا جو ابھی تک نکل رہا ہے۔ مولانا اپنی تفسیر "تدبر قرآن" مکمل کر چکے تو "تدبر حدیث" کی تکمیل میں لگ گئے۔ موطاء امام مالک اور صحیح بخاری کی حدیثوں کی شرح و ترجمانی سے متعلق حصے رسالہ تدبر میں برابر شائع ہو رہے ہیں۔ تدبر حدیث کا یہ سلسلہ بھی مولانا کے زریں کارناموں میں ہے۔

جو لوگ تقلید پر قانع اور قدماء کی روش پر چلنے ہی میں عافیت سمجھتے ہیں اور فنون و علوم اسلامیہ کے معروضی اور غیر جانبدارانہ مطالعہ کے عادی نہیں ہیں' یا جو لوگ اپنے مزعومہ مختلف عقائد و خیالات کے خلاف نہ کوئی سنجیدہ اور معقول بات سننے کو تیار ہوتے ہیں اور نہ اپنے حلقوں کے سوا کسی اور حلقہ کی کوئی بات اپنے کانوں میں پڑنے دینا چاہتے ہیں' ان کے لیے مولانا کی تفسیر' تشریح احادیث اور بعض تصنیفات کے کچھ مقامات نامانوس اور ناقابل قبول ہو سکتے ہیں۔ اس طرح کے لوگوں نے اس قسم کے بعض مسائل کو لے کر حسب عادت شور و غوغا بھی مچایا۔ مگر مولانا اجماع عام کے ان کے دعوے سے مرعوب نہیں ہوئے بلکہ اپنے اس خیال کو پوری جرأت کے ساتھ پیش کرتے رہے جسے وہ صحیح اور کتاب و سنت کے مطابق سمجھتے تھے۔

حقیقت یہ ہے کہ مولانا امین احسن اصلاحی جیسے بلند پایہ محقق' وسیع النظر عالم اور قرآن و حدیث کے ماہر سے جمہور کے تمام خیالات و آرا کی پابندی کا مطالبہ کرنا اور نہ کرنے پر سب و شتم اور تکفیر و تضلیل کا محاذ گرم کر دینا بڑی زیادتی اور انتہائی تنگ نظری ہے۔ ہر دور کے نابغہ روزگار علماء کے یہاں مجتہدانہ خیالات اور تفردات ملتے ہیں۔ ان کی بناء پر انہیں مطعون کرنا اور ان پر کفر و زندقہ کا الزام عائد کرنا علمی کم مائیگی اور عدم تدبر کا نتیجہ ہے۔ متقدمین اور دور حاضر میں بھی ایسے متعدد علماء گزرے ہیں جن کی سطح اپنے معاصرین سے بلند تھی اس لیے وہ اپنے عہد کے مزعومات اور تقلیدی رجحانات کا ساتھ نہیں دے سکے۔ اس لیے ابنائے زمانہ کے طعن و تشنیع کا نشانہ بنے۔ حالانکہ ایسے موقع پر بے صبری اور عجلت کے بجائے توقف و تامل اہل حق اور اصحاب علم کا شیوہ رہا ہے۔

مولانا امین احسن صاحب کی رگ و پے میں علامہ شبلی" کی صہبائے علم و ادب رقص کر رہی تھی۔ اور وہ ان کے طرز تحریر کو اردو انشاء پردازی کا اعلیٰ ترین نمونہ سمجھتے تھے۔ ان کی تحریروں کی رعنائی' دلکشی اور دلاویزی کا یہی سبب ہے۔ لیکن اب ان کی پختگی اور مشاق سے ان کا اپنا الگ اور جداگانہ رنگ و آہنگ بھی ہو گیا تھا۔ جس میں سادگی کے باوجود پرکاری ہوتی تھی۔ طبقہ علماء میں ایسی صاف' شستہ' سلیس' شگفتہ اور

رواں اردو لکھنے والے کم ملیں گے۔ ان کو عربی لکھنے پر بھی قدرت تھی۔ "الضیاء" (لکھنؤ) میں ان کے بعض عربی مضامین شائع ہوئے۔

مولانا کی قلمی زندگی کا آغاز صحافت سے ہوا تھا اور تصنیفی زندگی کی بسم اللہ کلمہ **لا الہ الا اللہ** کی تشریح سے ہوئی۔ پہلے حقیقت شرک لکھی۔ پھر حقیقت توحید۔ باقی تصنیفات کے نام یہ ہیں: حقیقت نماز۔ حقیقت تقویٰ۔ اسلامی ریاست میں فقہی اختلافات کا حل۔ اسلامی قانون کی تدوین۔ تزکیہ نفس۔ دعوت دین اور اس کا طریقہ کار۔ قرآن میں پردے کے احکام۔ مبادی تدبر قرآن۔ مبادی تدبر حدیث۔ مولانا حمید الدین فراہیؒ۔ اسلامی معاشرہ میں عورت کا مقام۔ عائلی کمیشن کی رپورٹ پر تبصرہ۔ فلسفے کے بنیادی مسائل قرآن حکیم کی روشنی میں۔ تفہیم دین۔ مقالات اصلاحی (جلد اول)

ان مستقل تصنیفات کے علاوہ مولانا فراہیؒ کی متعدد تصنیفات و رسائل کا اردو ترجمہ کیا۔ آخر میں تدبر قرآن کی نو جلدیں لکھیں اور تدبر حدیث پر کام کر ہی رہے تھے کہ پیام اجل آگیا۔ ع خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا۔

مولاناؒ نے بڑی مشغول علمی زندگی گزاری۔ انہوں نے طویل عمرپائی جو درس و تدریس، تصنیف و تالیف، اشاعت علم اور خدمت دین کے لیے وقف رہی۔ مدرسۃ الاصلاح میں درس و تدریس کا جو مشغلہ شروع کیا تھا وہ کسی نہ کسی شکل میں تاعمر جاری رہا۔

مجھے ان سے ملاقات کا شرف صرف ایک بار اس وقت حاصل ہوا جب وہ اپنے والد کی علالت کی خبر سن کر ۱۹۵۲ء میں ہندوستان اپنے آبائی وطن تشریف لائے تھے۔ مگر ان کے پہنچنے سے پہلے ہی ان کے والد کا انتقال ہو چکا تھا۔ اس وقت دونوں ملکوں کے تعلقات بہت کشیدہ تھے۔ پھر ان کا تعلق جس جماعت سے تھا اس کی وجہ سے انہیں گاؤں سے کہیں باہر جانے کی اجازت نہیں تھی۔ میں ان سے وہیں ملنے گیا تو بڑے لطف و محبت سے پیش آئے۔ میرے بڑے بھائی مولوی قمرالدین اصلاحی کے بارے میں دریافت کیا جن کا قلمی و ادبی نام قمر اعظمی ہے اور جن کو انہوں نے پڑھایا تھا۔ جب بھائی کے بارے میں انہیں معلوم ہوا کہ ان کا مشغلہ علمی نہیں ہے تو انہیں بڑا افسوس ہوا اور میرے ذریعہ سے انہیں یہ پیغام بھیجا کہ آخر ان کے علم، ان کی ذہانت و صلاحیت سے ان کی قوم و ملت اور ملک کو کیا فائدہ پہنچا۔

میری موجودگی میں مغرب کے بعد ان سے ملنے کے لیے مولانا قاضی اطہر مبارک پوری اپنے دو تین ساتھیوں کے ساتھ آئے اور عشاء سے پہلے واپس جانے لگے تو مولانا نے فرمایا کہ اس وقت رات میں کیوں جا رہے ہیں؟ قاضی صاحب نے کہا: ہم لوگ قریب کے ہیں۔ ابھی پہنچ جائیں گے۔ مولانا نے فرمایا کہ قریب کے لوگوں کو ہی روکا جاتا ہے۔ قاضی صاحب نے ہنس کر کہا: نہیں اجازت دیجئے، ہم لوگ بس نیاز حاصل کرنے آئے تھے۔ مولانا نے فرمایا: اجی حضرت! میں تو خود ہی نیازمند ہوں۔



میری ان سے یہی پہلی اور آخری ملاقات تھی۔ البتہ ان سے کبھی کبھی خط و کتابت رہتی تھی۔ "میثاق" کے لیے ان کی طلب پر میں نے چند مضامین لکھے۔ وہ میرے عزیز بھی ہو گئے تھے۔ ان کے ایک سگے پوتے عزیزی ابو ریحان جو افسوس ہے کہ دادری کے ہوائی حادثہ میں ۱۲/ نومبر۱۹۹۶ء کو جاں بحق ہو گئے ان سے میری لڑکی شاہین منسوب تھی۔ میں نے جب اپنی طرف سے اس رشتہ اور مولانا بدرالدین اصلاحی مرحوم کے نکاح پڑھانے کی انہیں اطلاع دی تو اس پر خوشی ظاہر کرتے ہوئے لکھا کہ تمہارا خط بہت مختصر تھا۔ اب جب خط لکھو تو دارالمصنفین اور مدرسۃ الاصلاح کا مفصل حال لکھو اور دونوں جگہ میرے جو ملنے اور جاننے والے لوگ موجود ہیں ان کا ذکر کرو۔ اور ان سے میرا سلام کہو۔ چنانچہ تعمیل حکم میں جب میں نے بڑا مفصل خط لکھا تو بہت خوش ہوئے اور جواب میں تحریر فرمایا کہ دراصل میں اسی طرح کا خط چاہتا تھا۔ اسی گرامی نامہ میں یہ بھی تحریر فرمایا تھا "میرا جی چاہتا ہے کہ ایک بار پھر وہاں آؤں۔ چاہے میرے جاننے والے ہوں یا نہ ہوں۔ مدرسۃ الاصلاح کے درو دیوار تو ہوں گے۔ ان ہی سے لپٹ کر اچھی طرح رولوں گا"۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ انہیں مدرسۃ الاصلاح سے جو ان کے استاد کی یادگار ہے، کتنا جذباتی تعلق تھا اور وہ اس کی ترقی و استحکام کے کس قدر آرزومند رہتے تھے۔ وہ پاکستان میں ضرور تھے لیکن ان کا دل یہاں اور یہاں کے لوگوں میں بھی اٹکا رہتا تھا۔ اور جب یہاں کے کسی شخص کو پا جاتے تھے تو فرط تعلق سے لپٹ جاتے تھے اور جو جو یاد آتا سب کا حال دریافت فرماتے۔

راقم کے ایک استاد مولوی قمرالزمان صاحب اصلاحی مرحوم جو مولانا امین احسن صاحبؒ کے عزیز تھے جس سال حج بیت اللہ کے لیے تشریف لے گئے اسی سال مولانا اصلاحی بھی پاکستان سے حج کے لیے آئے ہوئے تھے، وہ ان سے ملنے گئے تو ان کے پاس کئی ملکوں کے اہم اور معزز اشخاص بیٹھے ہوئے تھے لیکن ان کو دیکھتے ہی باغ باغ ہو گئے اور ان کی ساری توجہ کا مرکز یہی ہو گئے۔

جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم ایک دفعہ ان سے ملاقات کے لیے تشریف لے گئے تو ان کے اعزاز میں ایک بڑی لمبی اور شاندار دعوت کا اہتمام کیا۔ سید صاحب فرماتے تھے کہ مجھے ایسی پر تکلف اور شاندار دعوت کھانے کا اتفاق بہت کم ہوا تھا۔ وہ مولانا اصلاحی کے گرم جوشی سے ملنے اور خلوص و محبت کا اکثر ذکر فرماتے اور کہتے کہ جو لوگ ان کی یہاں موجودگی کے وقت دارالمصنفین کے کسی شعبہ سے وابستہ تھے ان سب کا نام لے کر ایک ایک شخص کے بارے میں دریافت کرتے رہے۔

دراصل دارالمصنفین سے بھی ان کو بڑا تعلق تھا۔ مولانا سید سلیمان ندویؒ اور مولانا عبدالسلام ندوی سے ملاقات کے لیے یہاں برابر آتے رہتے تھے اور خود سید صاحب بھی سرائے میر برابر تشریف لے جاتے تھے اور مولانا امین احسن صاحبؒ کی صلاحیتوں کے بڑے معترف تھے۔

مولانا حکیم محمد مختار اصلاحی ان کے عزیز شاگرد ہیں۔ ایک دفعہ ان کے بڑے صاحبزادے حکیم محمد فیاض صاحب پاکستان گئے اور ان سے ملے تو بڑی پذیرائی کی اور کہنے لگے مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلو۔ اگر کبھی بمبئی کے راستہ سے آیا تو تمہارے یہاں قیام کروں گا اور دہلی سے آنے پر عبد اللطیف اعظمی صاحب کے یہاں قیام کروں گا۔ یہ بھی ان کے چہیتے شاگرد ہیں۔

مولانا امین احسن صاحب" کھانے پینے کے جتنے شوقین تھے اس سے زیادہ دوسروں کو کھلا کر انہیں خوشی ہوتی تھی۔ ان کے یہاں اکثر دعوتیں ہوتی تھیں۔ اعظم گڑھ میں حکیم محمد اسحاق صاحب اپنی حذاقت فن' شرافت نفس اور جامع صفات حسنہ ہونے کی بناء پر ہر طبقہ میں بہت مقبول و محبوب تھے۔ مدرستہ الاصلاح اور اس کے ذمہ داروں سے بھی ان کے اچھے تعلقات تھے۔ مولانا امین احسن صاحب" ان کے بڑے بے تکلف اور خاص دوست تھے۔ حکیم صاحب کے نورتنوں میں مشہور شاعر جناب یحیٰی اعظمی اور دارالمصنفین کے رفقاء و وابستگان بھی تھے۔ ان سب کو مولانا اصلاحی سال میں دو مرتبہ اپنے دولت خانے پر مدعو کرتے۔ ایک تو جاڑے میں' جب ہرے مٹر اور گنا تیار ہوتا۔ اور دوسرے آموں کے موسم میں۔ حکیم صاحب کا سفر عموماً کشتی سے ہوتا تھا۔ مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی کو بھی ان دعوتوں میں شریک ہونے کا اتفاق ہوا تھا۔

مولانا اصلاحی" بڑے پر کشش' وجیہ و شکیل' جامہ زیب' بارعب اور نفاست پسند شخص تھے۔ انہیں صفائی بہت پسند تھی۔ کبھی ان کے جسم پر میلے کچیلے کپڑے نہیں دیکھے گئے۔ لباس سفید پہنتے تھے جس پر کہیں داغ دھبہ نہیں ہوتا تھا۔ لباس ہی کی طرح ان کا کمرہ بھی چمکتا اور جگمگاتا رہتا تھا۔ ان کی پڑھنے لکھنے کی میز بہت مرتب اور صاف ہوتی۔ ان کی ہر ہر چیز سے حسن' نفاست اور سلیقہ مندی ظاہر ہوتی تھی اور کہیں سے بدذوقی اور بے ڈھنگے پن کا پتہ نہیں چلتا تھا۔

ان میں حد درجہ غیرت' خودداری' استغنا اور بے نیازی تھی۔ کبھی کسی کا احسان مند ہونا گوارا نہیں کرتے تھے۔ وہ جس پایہ اور رتبہ کے شخص تھے' چاہتے تو ہر بڑا عہدہ اور اعزاز ان کو مل سکتا تھا۔ لیکن ان کے نزدیک ان چیزوں کی کوئی اہمیت ہی نہ تھی۔ ان کا قیام رحمن پورہ میں تھا جس کی حیثیت ایک گاؤں جیسی تھی۔ صدر ضیاء الحق مرحوم نے بہت چاہا کہ ان کے لیے لاہور یا جس بڑے شہر میں وہ پسند کریں ایک اچھا مکان تعمیر کرا دیں۔ مگر وہ اس کے لیے کسی طرح آمادہ نہیں ہوئے۔ وہ عام لوگوں سے بڑی تواضع اور انکسار سے پیش آتے تھے لیکن امراء اور ذی جاہ و حشمت اشخاص سے کبھی جھک کر نہیں ملے۔ طبیعت شاہانہ پائی تھی۔ ہمیشہ اچھی اور قیمتی چیزیں استعمال کرتے تھے۔ کوئی ادنیٰ اور معمولی چیز ان کی نگاہ میں جچتی ہی نہیں تھی۔ ہمیشہ سیکنڈ اور فرسٹ کلاس میں سفر کرتے۔ تانگے پر اکیلے سوار ہوتے۔ کشادہ دست تھے' پس انداز کرنے کی کبھی عادت نہیں رہی' جو پاس ہوتا بے دریغ خرچ کر ڈالتے۔ سائل کو اپنی حیثیت سے زیادہ



تے تھے۔ حرص و ہوس کا کوئی شائبہ بھی ان میں نہیں تھا۔

اللہ تعالیٰ نے ان کو جن اعلیٰ و برتر مقاصد کے لیے پیدا کیا تھا انہی میں شب و روز منہمک رہتے۔ گھر گرہستی کے کاموں سے کوئی سروکار نہ رکھتے۔ ان کی ضرورتوں کا سامان ان کے عزیز اور احباب مہیا کرتے تھے جن سے کہا کرتے کہ **انتم اعلم بامور دنیاکم**۔ جب کسی پر غصہ آتا اور بہت برہم ہو جاتے تو بعض اوقات کچھ سخت سست اور ناگفتنی بھی کہہ جاتے لیکن جلد ہی ان کا غصہ فرو ہو جاتا۔ کسی سے کینہ کدورت نہ رکھتے۔

مولانا امین احسن" اصلاحی کو تحریر ہی کی طرح تقریر کا بھی خداداد ملکہ تھا۔ ان کا یہ جوہر طالب علمی ہی کے زمانے میں کھل گیا تھا۔ مولانا عبد الرحمٰن نگرامی کی صحبت میں اسے مزید ترقی ہوئی۔ وہ خلافت اور مولانا علی کے ساتھ جمعیت کے جلسوں میں شریک ہوتے اور اپنی جادوبیانی کا سکہ جما دیتے۔ بعض ثقہ مشاہدین نے مجھے بتایا کہ ان کی تقریروں کے سامنے مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی کی تقریریں پھیکی ہو جاتی تھیں۔ جماعت اسلامی سے وابستہ ہوئے تو اس حلقہ کے سب سے بڑے مقرر وہی تھے۔ وہ کئی کئی گھنٹے تک بولتے مگر تسلسل اور حسن بیان میں فرق نہیں آتا تھا۔ وہ مدرستہ الاصلاح کے گل سرسبد تھے ہی' حق یہ ہے کہ پورے برصغیر میں اس پایہ کے عالم' خطیب اور مصنف کم ہی لوگ ہوں گے۔ ان کی کتابوں کی تعداد بعض مصنفین کے مولفات و رسائل کی طرح چاہے سینکڑوں نہ ہو لیکن جن لوگوں کی کمیت کے بجائے کیفیت پر بھی نظر رہتی ہے وہ یہی کہیں گے۔

بغاث الطیر اکثر ھا فراخا

و ام الصقر مقلاۃ نزور

مولانا امین احسن اصلاحی کی موت علم و دین کا بڑا خسارہ ہے جس کی تلافی کا بظاہر امکان نہیں۔ ان کے بعض تلامذہ خصوصاً جناب خالد مسعود صاحب سے ہماری بڑی توقعات وابستہ ہیں۔ ان سے گزارش ہے کہ مولانا نے جو مشن برپا کیا تھا اسے جاری رکھیں۔

اللہ تعالیٰ علم و دین کے اس خادم کی مغفرت فرمائے اور عزیزوں اور اہل تعلق کو صبر جمیل مرحمت فرمائے **اللھم صبب علیہ شابیب رحمتک و برد مضجعہ واجعل الجنۃ مثواہ**۔

ڈاکٹر ظفر الاسلام اصلاحی

# جامع کمالات شخصیت

۵ دسمبر ۱۹۹۷ء کو ممتاز مورخ' معروف دانشور استاد گرامی پروفیسر خلیق احمد نظامی صاحب اس دنیا سے رخصت ہو گئے اور تاریخ و تمدن' مذہب و تصوف' تعلیم و نامور شخصیات' سرسید' ایم اے او کالج اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پر دو درجن سے زائد کتابوں اور سینکڑوں مضامین کی صورت میں اپنی قیمتی یادگاریں چھوڑ گئے۔ ابھی ان کا غم ہلکا نہیں ہو پایا تھا کہ ۱۵ دسمبر (۱۳ شعبان المعظم ۱۴۱۸ھ) کو مدرستہ الاصلاح (سرائے میر' اعظم گڑھ) کے نامور فرزند و ممتاز مفسر قرآن مولانا امین احسن اصلاحی صاحب لاہور میں تقریباً ۹۳ سال کی عمر میں وفات پا گئے (**انا للہ وانا الیہ راجعون**)

مولانا امین احسن اصلاحی ماہر قرآنیات اور ایم اے او کالج علی گڑھ کے قدیم طالب علم و استاد شعبہ عربی مولانا حمید الدین فراہی (۱۸۶۳ء۔ ۱۹۳۰ء) کے شاگرد رشید تھے۔ عربی زبان' لغت و ادب' تفسیر و حدیث اور فلسفہ و علم سیاسیات میں انہیں مہارت حاصل تھی اور قدیم صحف سماوی پر بھی وہ گہری نظر رکھتے تھے۔ ۱۹۲۲ء میں مدرستہ الاصلاح سے فراغت کے بعد تقریباً ۷۵ سال تک مولانا اصلاحی درس و تدریس' تصنیف و تالیف اور خطابت و صحافت کے ذریعہ دعوت دین اور علوم اسلامیہ بالخصوص علم قرآن کے میدان میں نمایاں خدمات انجام دیتے رہے۔ ان کی عمر عزیز کا بیشتر حصہ قرآن و سنت کی روشنی میں اسلام کی تشریح و ترجمانی' دینی علوم کی اشاعت اور قرآنی فکر کے فروغ میں گذرا۔ اس کی روشنی میں بجا طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کی وفات نہ صرف ان کے اعزہ و اقرباء و متعلقین مدرستہ الاصلاح اور وابستگان ادارہ تدبر قرآن و حدیث (لاہور) بلکہ پوری ملت اسلامیہ کے لئے ایک سانحہ ہے۔

مولانا فراہی نے اپنی عمر کے آخری حصہ میں جن شاگردوں کی مخصوص طور پر تربیت فرمائی' ان میں قرآنی ذوق پروان چڑھایا اور ان کی صلاحیتوں کو جلا بخشا ان میں سرفہرست مولانا اختر احسن اصلاحی" اور مولانا امین احسن اصلاحی" تھے۔ قرآن کریم سے گہرا شغف' قرآنی فکر کی اشاعت اور قرآن کی تفسیر میں نظم قرآن کے پہلو پر زور جو مولانا فراہی کے امتیازات تھے وہ ان کے ان دونوں اقرب و ارشد تلامذہ میں بھی جلوہ گر تھے۔ ۱۹۵۸ء میں مولانا اختر احسن اصلاحی کی وفات کے بعد مولانا امین احسن اصلاحی نہ صرف فکر فراہی کے امین بلکہ اس کے سب سے بڑے شارح و ترجمان بھی رہے۔ ہندوستان میں مولانا اصلاحی کے شاگردوں میں مولانا بدر الدین اصلاحی' جو مولانا فراہی کے مسودات کی تصحیح و ترتیب اور فکر فراہی کی تشریح کے لیے معروف تھے' جون ۱۹۹۶ء میں وفات پا چکے ہیں [۱]۔ اس لحاظ سے مولانا اصلاحی کے انتقال کر جانے سے حلقہ فراہی میں ایک بہت بڑا خلا پیدا ہو گیا ہے جس کا پر ہونا بہت مشکل نظر آتا ہے۔



مولانا امین احسن اصلاحی کی دینی و علمی خدمات کی فہرست بہت طویل ہے۔ ان کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ پاکستان ہجرت سے قبل وہ مادر علمی کی تعمیر و ترقی میں مصروف رہے۔ قرآن کی محققانہ تعلیم اور دیگر مضامین کو اس نقطہ نظر سے پڑھنا کہ ان سے قرآن فہمی میں آسانی ہو مدرسہ کے تعلیمی نظام کا امتیاز رہا ہے۔ مولانا فراہی کے تشکیل کردہ انہی خطوط پر انہوں نے اپنے رفقاء کے ساتھ اس ادارہ کی توسیع و ترقی میں بھرپور حصہ لیا۔ طلبہ میں قرآن فہمی کا ذوق اجاگر کیا' ان کی صلاحیتوں کو نکھارا اور مدرسہ کی علمی فضا کو پروان چڑھانے میں ہر ممکن کوشش کی۔ ۱۹۳۵ء میں مدرستہ الاصلاح میں دائرہ حمیدیہ کا قیام عمل میں آیا۔ اس کا خاص مقصد قرآنی افکار کی اشاعت' مولانا فراہی کے مسودات کی تصحیح و طباعت اور ان کے اردو تراجم کا اہتمام تھا۔ اس کے صدر ڈاکٹر حفیظ اللہ (راقم کے ماموں) اور نائب صدر جناب عبد الغنی انصاری" مقرر ہوئے۔ مسودات کی تصحیح و ترتیب مولانا اختر احسن اصلاحی" کے سپرد ہوئی۔ مطبوعات کا اردو ترجمہ اور دائرہ کے کاموں کی عمومی نگرانی مولانا امین احسن اصلاحی کی ذمہ داری قرار پائی۔ اس ادارہ کے ترجمان کے طور پر جب جنوری ۱۹۳۶ء سے ماہنامہ "الاصلاح" کا اجراء ہوا تو اس کی ادارت بھی مولانا اصلاحی کے سپرد ہوئی [۲]۔ مولانا نے ان تمام امور کو بحسن و خوبی انجام دیا اور دائرہ کے کاموں کو آگے بڑھانے میں پوری دلچسپی و انہماک کا مظاہرہ کیا۔ مجلہ "الاصلاح" قرآنیات کے ساتھ مخصوص تھا' علمی انداز و بلند معیار اس کا امتیاز تھا۔ اس کی مدت اشاعت محض چار سال (۱۹۳۶ء۔ ۱۹۳۹ء) تک محدود رہی لیکن اس مختصر مدت میں جو مضامین' مقالات و تبصرے اس میں شائع ہوئے وہ معیار و مواد کے اعتبار سے دینی و علمی لٹریچر کا ایک قیمتی سرمایہ کہے جا سکتے ہیں۔ اس کا اندازہ ۱۹۹۱ء میں ادارہ علوم القرآن (سرسید نگر' علی گڑھ) سے شائع شدہ کتاب "قرآنی مقالات" سے لگایا جا سکتا ہے جو "الاصلاح" کے منتخب قرآنی مقالات کا مجموعہ ہے۔ مزید برآں مولانا اصلاحی نے دائرہ حمیدیہ کے تحت مولانا فراہی کی عربی مطبوعات۔ نظام القرآن و تاویل الفرقان بالفرقان (۱۳ سورتوں کی تفسیر کا مجموعہ)' **فاتحہ نظام القرآن**' **الامعان فی اقسام القرآن** اور **الرای الصحیح فی من هو الذبیح** کو اردو میں منتقل کر کے اردو داں طبقہ کو قرآنیات کے ایک اہم ذخیرہ سے استفادہ کا موقع فراہم کیا [۳]۔ اس کے علاوہ مولانا اصلاحی نے اپنے مضامین' کتابوں و خطبات کے ذریعہ بھی مولانا فراہی کے مخصوص منہج تفسیر کی تشریح اور ان کے افکار کے فروغ کو ایک فریضہ سمجھا اور اسے بخوبی انجام دے کر ان کے شاگرد رشید ہونے کا حق ادا کیا۔ واقعہ یہ ہے کہ آج ہند و بیرون ہند میں اہل علم کا ایک اچھا خاصہ حلقہ مولانا اصلاحی کے اردو تراجم اور طبع زاد تصانیف کے توسط سے مولانا فراہی کی شخصیت اور تفسیر و قرآنی علوم کے میدان میں ان کے عظیم الشان کارناموں سے متعارف ہو چکا ہے۔ یہ بجائے خود مولانا اصلاحی کی بہت بڑی خدمت ہے جس کا عام طور پر اعتراف کیا جاتا ہے۔

مولانا امین احسن اصلاحی دعوت دین کے جذبہ سے بھی سرشار تھے۔ وہ نامور مفکر اسلام مولانا سید

ابوالاعلیٰ مودودی کے افکار و خیالات سے پہلے ہی سے متاثر اور تحریک اسلامی کو منظم طور پر چلانے کے لئے ان کے پیش کردہ خاکے و پروگرام سے متفق تھے۔ ۲۶ اگست ۱۹۴۱ء کو جماعت اسلامی کی باقاعدہ تشکیل کے کچھ دن بعد انہوں نے اس کی رکنیت قبول کر لی اور اس کے کاموں میں سرگرمی سے حصہ لینے لگے۔ نائب امیر اور بوقت ضرورت قائم مقام امیر کے فرائض بھی انجام دیے۔ امیر جماعت کی خواہش کے احترام میں وہ ۱۹۴۵ء (؟) میں دارالاسلام پٹھان کوٹ (جہاں جماعت کا صدر دفتر قائم تھا) چلے گئے اور تقسیم ہند کے بعد انہوں نے پاکستان میں سکونت اختیار کی۔ اسی دوران جب جماعت کا مرکز لاہور منتقل ہوا تو یہی شہر ان کا مستقل مسکن بن گیا۔ وہ سید ابوالاعلیٰ مودودی کی قیادت میں تحریک اسلامی کے کاز کو آگے بڑھانے میں پوری توجہ و تندہی سے مصروف رہے۔ اسی دوران انہوں نے امیر محترم کی رفاقت میں دو ڈھائی سال قید و بند کی زندگی بھی گزاری اور وہاں بھی دینی و علمی مصروفیات جاری رہیں۔ ان کی ایک اہم کتاب "دعوت دین اور اس کا طریق کار" حیات زندانی کی یادگار ہے۔ لیکن جماعت اسلامی سے ان کی یہ گہری وابستگی اور مولانا مودودی سے ان کی دیرینہ رفاقت ۱۹۵۸ء میں ختم ہو گئی جب بعض مسائل میں ان سے اختلاف کی وجہ سے وہ جماعت سے علیحدہ ہو گئے۔

جماعت اسلامی سے رسمی علیحدگی کے باوجود مولانا امین احسن بدستور تبلیغ دین و تحریک اسلامی کے کاموں میں دلچسپی لیتے رہے بلکہ انہیں حرزجان بنائے رکھا۔ دعوت دین کے فریضہ کی انجام دہی کے لئے انہوں نے مختلف طریقے اختیار کیے۔ مولانا اصلاحی کی دینی، دعوتی اور علمی سرگرمیاں جاری رہیں اور منظر عام پر آتی رہیں۔ اسی کے ساتھ قرآنی فکر کی ترویج و اشاعت کے لئے "تدبر قرآن" کے نام سے تفسیر قرآن لکھنا شروع کی۔ مزید برآں تحریر و تقریر دونوں ذرائع سے وہ قرآن کے پیغام کو عام کرنے اور قرآن و سنت کی روشنی میں معاشرہ کی اصلاح و تعمیر کے لئے کوشاں رہے۔ اس طرح انہوں نے بعد کی پوری زندگی بھی دعوت دین کے تقاضوں کو پورا کرنے میں بسر کر دی اور وہ اس صورت میں کہ اپنی صلاحیتوں کو قرآن کی خدمت کے لئے وقف کر دیا اور اپنے اوقات کو قرآن و حدیث کی تشریح و ترجمانی اور درس و خطبات و مذاکرات کے ذریعہ لوگوں کی دینی و اخلاقی تربیت میں لگا دیا۔ ظاہر ہے کہ قرآن و سنت کی تعلیمات کی اشاعت اور ان دونوں منابع رشد و ہدایت سے لوگوں کا تعلق مضبوط کرنے کی کوشش و تحریک سے بڑھ کر دعوت دین اور کیا ہو سکتی ہے!

مولانا امین احسن اصلاحی کی تحریری صلاحیتیں ان کی طالب علمی کے زمانہ سے ہی ظاہر ہونی شروع ہو گئی تھیں۔ مدرسۃ الاصلاح سے فراغت کے کچھ عرصہ بعد سے ان کے مضامین و مقالات شائع ہونے لگے اور دائرہ حمیدیہ کی مصروفیات کے ساتھ ان کی تصنیفی و تالیفی سرگرمیوں کا باقاعدہ آغاز ہوا جو آخر عمر تک جاری رہا۔ اس طویل عرصہ حیات میں مولانا مرحوم نے استاد گرامی کی عربی کتب کے ترجمہ کے علاوہ



قرآن، حدیث، فقہ، فلسفہ، دعوت دین، تحریک اسلامی، اصلاح معاشرہ، اسلامی ریاست و حکومت سے متعلق اہم موضوعات پر بیس سے زائد کتابیں تالیف کیں اور سینکڑوں مضامین، مقالات و تبصرے تحریر کئے جو شائع ہو کر دینی و علمی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھے گئے۔ تصنیف و تالیف کے میدان میں مولانا اصلاحی کا سب سے عظیم الشان کارنامہ "تدبر قرآن" ہے جسے اردو تفاسیر میں ایک امتیازی مقام حاصل ہے اور بجا طور پر اسے شاہکار تفسیر کہا جا سکتا ہے۔ ۱۹۵۹ء میں اس تفسیر کی قسطیں ماہنامہ میثاق (لاہور) میں شائع ہونا شروع ہو گئی تھیں اور یہ ۱۹۸۰ء میں مکمل ہوئی [4]۔ کتابی صورت میں اس تفسیر کی اشاعت کی ابتداء ۱۹۶۷ء میں ہوئی۔ اس وقت یہ ۹ جلدوں میں ادارہ فاران فاؤنڈیشن، لاہور کے زیر اہتمام باقاعدگی سے شائع ہو رہی ہے۔ ہندوستان میں تاج کمپنی دہلی سے اس تفسیر کی پہلی اشاعت ۱۹۸۹ء میں عمل میں آئی۔

"تدبر قرآن" ایک بہت ہی جامع و مبسوط تفسیر ہے جس میں قرآنی آیات کے معنی و مفہوم کی وضاحت میں حسب ضرورت و موقع نحو و صرف، لغت و ادب، احادیث، فقہی مسائل، تاریخ، جغرافیہ و علم آثاریات (ARCHAEOLOGY) مختلف پہلوؤں سے بحث کی گئی ہے لیکن اس کا خاص امتیاز نظم قرآن کے پہلو کو نمایاں کرنا ہے۔ مولانا مرحوم کے استاد گرامی مولانا فراہی "تفسیر قرآن کے باب میں نظام قرآن کو بہت زیادہ اہمیت دیتے تھے اور فہم القرآن کی راہ میں اس کے کلیدی کردار کے قائل تھے۔ مولانا فراہی اس فکر کے حامل اور پرزور داعی تھے کہ قرآن مجید شروع سے آخر تک بلحاظ سورہ اور بلحاظ آیات بھی ایک مرتب، مربوط و منظم کلام ہے۔ ہر سورہ میں ایک مرکزی مضمون (یا عمود) پایا جاتا ہے اور سورہ کی تمام آیات اسی مرکزی مضمون کی توضیح و تشریح کرتی ہیں اور ان سے اس طرح جڑی ہوئی ہیں کہ ہر سورہ ایک مکمل وحدت کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ اسی طرح ہر سورہ اور ماقبل و مابعد کی سورہ میں ایک فطری ربط و مناسبت ہے۔ تمام سورتیں مضمون کے اعتبار سے اس طرح باہم مربوط اور ایک دوسرے سے منسلک ہیں کہ پورا قرآن ایک وحدت بن جاتا ہے۔ مولانا فراہی کا خیال تھا کہ اس نقطہ نظر سے قرآن کریم میں تدبر و تفکر سے اس کے فہم کی راہیں ہموار ہوتی ہیں اور نظم قرآن کے اصول کی روشنی میں تفسیر قرآن سے اس کتاب عظیم و عزیز کے گنجینہ معارف و حکم تک رسائی آسان ہو جاتی ہے [5]۔ اسی اصول کے مطابق مولانا فراہی نے عربی میں تفسیر لکھنی شروع کی تھی جسے وہ مکمل نہ کر سکے۔ ان کے شاگرد رشید نے "تدبر قرآن" میں اسے پوری طرح عملی طور پر برت کر ایک عظیم الشان کارنامہ انجام دیا اور استاد گرامی کے اصول و منہج تفسیر کو فروغ دیا۔ انہی خصوصیات کی بناء پر ہند و پاک کے دینی و علمی حلقوں میں "تدبر قرآن" کو کافی مقبولیت حاصل ہوئی اور جدید دور کی اردو تفاسیر میں اسے بین الاقوامی شہرت ملی [6]۔ پروفیسر مستنصر میر نے ۱۹۸۳ء میں مشی گن یونیورسٹی (امریکہ) سے اس تفسیر پر پی ایچ ڈی مکمل کی۔ ان کا یہ تحقیقی مقالہ

کے نام سے امریکن ٹرسٹ پبلیکیشنز' انڈیانا پولس (انڈیانا' امریکہ) سے ۱۹۸۶ء میں شائع ہو چکا ہے [۷]۔
مولانا مرحوم کی باقی مطبوعہ کتب میں خصوصی طور پر قابل ذکر یہ ہیں: مبادی تدبر قرآن' مبادی تدبر حدیث' حقیقت شرک و توحید' حقیقت نماز [۸]۔ حقیقت تقویٰ' تزکیہ نفس' تفہیم دین' دعوت دین اور اس کا طریق کار۔ اسلامی قانون کی تدوین' اسلامی ریاست' اسلامی معاشرہ میں عورت کا مقام' فلسفہ کے بنیادی مسائل قرآن حکیم کی روشنی میں' اور مقالات اصلاحی۔

مولانا مرحوم کی اولین دونوں کتابیں اس لحاظ سے بہت اہم اور وقیع ہیں کہ وہ قرآن و حدیث کے مطالعہ اور ان کے معانی و مطالب کو سمجھنے کے لئے رہنما خطوط فراہم کرتی ہیں۔ جدید علمی مزاج و ماحول میں فلسفہ سے متعلق مولانا کی مذکورہ کتاب کافی اہمیت و معنویت رکھتی ہے۔ اس کتاب میں اول انہوں نے اس غلط فہمی کو رفع کیا ہے کہ مذہب اسلام کا عقل سے کوئی تعلق نہیں ہے اور یہ بلا سمجھے بوجھے ماننے کی چیز ہے۔ ان کے خیال میں اس غلط فہمی کی وجہ سے مذہب سے تعلق ایک بے روح تعلق ہوتا ہے۔ دوسرے انہوں نے فلسفہ کے بنیادی مسائل اور ان کے بارے میں معروف فلاسفہ کی آراء کا تنقیدی جائزہ لے کر ان کی کمزوریوں کی نشاندہی کی ہے اور پھر قرآن حکیم کی روشنی میں ان پر غور کر کے یہ واضح کیا ہے کہ ان مسائل سے متعلق قرآن کا پیش کردہ حل کتنا مستند و محکم ہے۔ مولانا مرحوم کی رائے میں قرآن کی روشنی میں فلسفہ کے مسائل پر غور کرنے سے نہ صرف قرآن کے حکم و معارف کی قدر و قیمت واضح ہوتی ہے بلکہ اس میں ایمان و یقین بھی مزید پختہ ہوتا ہے [۹]۔

صحافت سے بھی مولانا اصلاحی مرحوم کا گہرا تعلق رہا ہے۔ بلکہ ان کی عملی زندگی کا آغاز ہی صحافت کے مشغلہ سے ہوا۔ پہلے مدینہ اخبار سے منسلک رہے اور دوسرے اخبارات کے لئے بھی مضامین لکھتے رہے اور یہ سلسلہ ۱۹۲۲ء سے ۱۹۲۵ء تک جاری رہا۔ پھر مختلف ادوار میں ماہنامہ الاصلاح' سرائے میر (۱۹۳۶ - ۱۹۳۹ء) اور میثاق' لاہور (۱۹۵۹ - ۱۹۶۳ء) کی ادارت کے فرائض انجام دیے۔

۱۹۸۰ء میں تفسیر تدبر قرآن کی تکمیل کے بعد مولانا مرحوم نے درس' مذاکرہ' تحقیق و تصنیف کے ذریعہ قرآنی فکر کو مزید فروغ دینے اور قرآن و حدیث کی تعلیمات کی اشاعت کے لئے ادارہ تدبر قرآن و حدیث قائم کیا اور 1981ء میں اس ادارہ کے ترجمان کے طور پر ماہنامہ تدبر کا اجراء عمل میں آیا جو مولانا اصلاحی کی زیر نگرانی ۱۹۹۷ء تک ترتیب دیا جاتا رہا۔ درس قرآن کے ساتھ ساتھ مولانا مرحوم نے احادیث کی تشریح و توضیح کا سلسلہ درس کی صورت میں شروع کیا تھا جس پر تفسیر کی تکمیل کے بعد انہوں نے خصوصی توجہ دی۔ اسے ٹیپ میں محفوظ کر لیا گیا۔ ادھر کچھ عرصہ سے اس کی قسطیں بھی "تدبر حدیث" کے



عنوان سے ماہنامہ تدبر میں شائع ہو رہی ہیں۔ مولانا کے زیر ادارت و اہتمام جتنے رسائل جاری ہوئے ان سب میں قرآن و سنت کی روشنی میں اسلام و اسلامی تعلیمات کی تشریح و ترجمانی اور مولانا فراہی کی علمی خدمات بالخصوص ان کے منہج تفسیر کا مطالعہ و تعارف' مشترک وصف رہا ہے [۱۰]۔ اس طرح صحافت کے میدان میں بھی مولانا کی صلاحیتیں قرآن و حدیث کی خدمت اور علم دین کی اشاعت میں صرف ہوئیں۔

اللہ تعالیٰ نے مولانا امین احسن اصلاحی مرحوم کو تحریر کے ساتھ درس و خطابت کا بھی بہترین ملکہ عطا کیا تھا اور یہ بھی دین کے کاموں میں خوب استعمال ہوا۔ تصنیفی و تالیفی سرگرمیوں کے ساتھ درس و تدریس' مذاکرہ و تقریر کے ذریعہ بھی انہوں نے دین کی دعوت و علم دین کی اشاعت کی خدمت انجام دی۔ انہوں نے خاص طور سے قرآن و سنت کی روشنی میں نوجوانوں اور جدید ذہن والوں کی تعلیم و تربیت اور ان میں دینی شعور و دینی جذبہ بیدار کرنے کے لئے اس صلاحیت سے کام لیا۔ مدرسۃ الاصلاح میں تقریباً ۲۰ سال تک استاد یا معلم کے فرائض انجام دیتے ہوئے طلبہ کی ذہنی تربیت اور دین و علم دین کی خدمت کے لئے ان کی صلاحیتوں کی آبیاری پر خصوصی توجہ دی۔ یہاں سے رخصت ہونے کے بعد پھر کسی مرحلہ میں وہ کسی مدرسہ' دارالعلوم یا جامعہ سے منسلک نہیں ہوئے تاہم درس کے حلقوں' علمی مجالس و مذاکرات کے ذریعہ تعلیم و تربیت میں ان کی دلچسپی بخوبی قائم رہی۔ ۱۹۶۰ء کے بعد اس طرح کے کاموں میں ان کی دلچسپی زیادہ نمایاں نظر آتی ہے۔ ۱۹۶۳ء میں انہوں نے "حلقہ تدبر قرآن" قائم کیا۔ اس کا خاص مقصد باصلاحیت نوجوانوں کو دینی علوم سے آراستہ کرنا' ان میں دینی اسپرٹ پیدا کرنا اور جدید تعلیم یافتہ لوگوں کو قرآن و حدیث کی تعلیمات کی روشنی میں تربیت دینا تھا تاکہ دین میں بصیرت رکھنے کے ساتھ موجودہ حالات پر نظر رکھنے والے افراد تیار ہوں اور ملت کی بہتر خدمات انجام دے سکیں۔ اسی مقصد کے پیش نظر حلقہ تدبر قرآن کے زیر اہتمام باضابطہ طور پر قرآن و حدیث کے درس اور عربی زبان سکھانے کا نظم جاری ہوا اور ذی استعداد طلبہ و جدید تعلیم یافتہ لوگوں کو دینی ماحول میں تربیت دینے کا سلسلہ بھی قائم رہا [۱۱]۔ یہ حلقہ تعلیم و تربیت جب کافی مفید ثابت ہوا اور اس کے امید افزاء نتائج سامنے آئے تو ۱۹۸۰ء میں اس کو وسعت و ترقی دے کر مولانا مرحوم نے "ادارہ تدبر قرآن و حدیث" قائم کیا اور واقعہ یہ ہے کہ اولین حلقہ کے تربیت یافتہ افراد ہی اس ادارہ میں کام آئے اور اس کی سرگرمیوں کو آگے بڑھانے میں مولانا کے دست و بازو بنے۔ ادارہ کی نگرانی میں مولانا کا درس قرآن و حدیث ایک طویل عرصہ تک جاری رہا۔ اس بابرکت پروگرام کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ مختلف مشاغل کے لوگ کثیر تعداد میں اس میں مشتاقانہ شریک ہوتے۔ مولانا مرحوم نے درس کا یہ طویل سلسلہ جس محنت و لگن سے جاری رکھا اور اس کے ذریعہ عوام و خواص میں قرآن و سنت کے جو موتی بکھیرے اور اسلام و اسلامی شریعت کے ان دونوں بنیادی ماخذ سے ان کا تعلق مضبوط کرنے کے لیے جو ان تھک کوشش کی وہ یقیناً دین کی بہت بڑی خدمت ہے اور دعوت دین اور اصلاح

معاشرہ کے کاموں سے ان کی گہری وابستگی کی روشن دلیل ہے۔

مختصر یہ کہ طالب علمی و تدریسی، تصنیفی و تالیفی، تحریکی و تذکیری ہر میدان میں مولانا امین احسن اصلاحی کی شخصیت نمایاں رہی ہے اور اس سے اہم یہ کہ ہر شعبہ حیات میں قرآن و سنت سے اپنا تعلق مضبوط رکھا اور ان سے دوسروں کا تعلق مضبوط کرنے کی کوشش کی۔ ہر مسئلہ و ہر معاملہ میں انہوں نے قرآنی فکر کی تشریح و ترجمانی کو مقدم رکھا اور اسی فکر کو عام کرنے کے لئے اپنی تمام تر صلاحیتوں کو وقف کر دیا۔ استاد گرامی کی تعلیم و تربیت اور اللہ رب العزت کے فضل و کرم سے انہیں کتاب عزیز سے جو قربت نصیب ہوئی تو زندگی کے ہر موڑ پر اسی کو انہوں نے اپنا مشعل راہ بنایا اور آزمائشوں و فتنوں سے بھری اس دنیا میں اسی کو اپنا بہترین رفیق و مونس سمجھا۔

مولانا امین احسن اصلاحی کی انمول علمی یادگاروں میں مدرسۃ الاصلاح بھی شامل ہے۔ طالب علم اور استاد کی حیثیت سے انہوں نے وہاں تقریباً تیس برس گزارے۔ مادر علمی سے انہیں فطری طور پر قلبی تعلق تھا اور اس کی تعمیر و ترقی کے لئے وہ ہمیشہ خواہاں و کوشاں رہے۔ ایک جانب مولانا مرحوم کی صلاحیتوں کو نکھارنے، ان کے تحریری و تقریری جوہر کو چمکانے اور ان کے علم و فن کو گہرائی و گیرائی عطا کرنے میں مدرسہ کی تعلیم اور مولانا فراہی و دوسرے اساتذہ کی تربیت کا فیض رہا تو دوسری جانب مولانا مرحوم کی تفسیر "تدبر قرآن" اور دیگر علمی و دینی خدمات سے مدرسہ کی جو نیک نامی ہوئی، ہند و بیرون ہند کے ایک وسیع حلقہ میں اسے جو تعارف ملا، اور اس کے نظام تعلیم و تربیت کو جو قدردانی نصیب ہوئی اس سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔ مدرسہ کے بہت سے فارغین اپنے نام کے ساتھ "اصلاحی" لکھتے ہیں لیکن مولانا مرحوم کے ساتھ یہ نسبت ایسی پختہ و معروف ہو گئی تھی کہ صرف "مولانا اصلاحی" کہنے پر اول وہلہ ذہن انہی کی طرف جاتا۔

مولانا مرحوم کے تلامذہ میں مولانا ابو اللیث اصلاحی ندوی، مولانا عزیز الرحمن اصلاحی، مولانا عبد الرحمن پرواز اصلاحی، مولانا داؤد اکبر اصلاحی، مولانا اظہار الدین اصلاحی، مولانا بدر الدین اصلاحی، مولانا صدر الدین اصلاحی، حکیم فیاض احمد اصلاحی، مولانا عبد الرحمن ناصر اصلاحی و ڈاکٹر عبد اللطیف اعظمی قابل ذکر ہیں۔ آخر الذکر چار کے علاوہ باقی وفات پا چکے ہیں"[۱۲]۔

مولانا مرحوم کے پسماندگان میں دو صاحبزادے (جناب ابو سعد اصلاحی، جناب ابو سعید) اور دو صاحبزادیاں (محترمہ شیما، و محترمہ مریم) ہیں۔ اول الذکر کے علاوہ باقی پاکستان میں سکونت پذیر ہیں۔ علی گڑھ میں پروفیسر اشتیاق احمد ان کے قریبی عزیز (بھتیجے) ہیں جو گذشتہ سال مسلم یونیورسٹی (شعبہ سیاسیات) کی سروس سے سبکدوش ہوئے ہیں۔

ان سب کے علاوہ سب سے قیمتی چیز جو مولانا امین احسن اصلاحی مرحوم نے چھوڑی ہے وہ ان کی



ذاتی و علمی زندگی کا یہ سبق ہے کہ قرآن و سنت سے تعلق کو مضبوط کیا جائے۔ انہی کے زریں اصولوں اور روشن تعلیمات کو زندگی کے ہر شعبہ میں دخیل و موثر بنایا جائے۔ درحقیقت یہی شاہراہ فوز و فلاح ہے۔ یہی وسیلہ اخروی ہے اور یہی ذریعہ راحت ابدی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی بال بال مغفرت فرمائے اور انہیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام سے نوازے اور ہم سب کو ان کی زندگی کے قیمتی سبق پر عمل کرنے کی توفیق عنایت کرے۔ (آمین ثم آمین)

## حواشی و مراجع

۱۔ شرف الدین اصلاحی، ذکر مولانا بدر الدین اصلاحی کا، مجلہ انجمن طلبہ مدرسۃ الاصلاح مرحوم اصلاحی شخصیات نمبر، ۱۹۹۶ء ص ۶۸ - ۶۹

۲۔ امین احسن اصلاحی، اداریہ "الاصلاح" ۱/ ۱، ۱۹۳۶ء ص ۵ - ۶، محمد اجمل اصلاحی، الدائرۃ الحمیدیۃ، ثقافۃ الہند، ۳۱/ ۱ - ۳، ۱۹۸۰ء، ص ۱۰۵ - ۱۱۵، اشتیاق احمد ظلی، اداریہ علوم القرآن، ۱۰/ ۱ - ۲، ۱۹۹۵ء، ص ۵ - ۷

۳۔ مولانا فراہی کی عربی کتب کے اردو تراجم کی تفصیلات کے لئے ملاحظہ فرمائیں۔ ظفر الاسلام اصلاحی، کتابیات فراہی، ادارہ علوم القرآن، علی گڑھ ۱۹۹۱ء، ص ۳۸ - ۴۰

۴۔ تدبر قرآن کے پہلے ایڈیشن کی ۸ جلدیں لاہور کے مختلف اداروں سے (اول و دوم دارالاشاعت الاسلامیہ سے ۱۹۶۷ - ۱۹۷۱ء میں، سوم تا چہارم انجمن خدام القرآن سے ۱۹۷۳ - ۱۹۷۶ میں اور پنجم تا ہشتم فاران فاؤنڈیشن سے ۱۹۷۷ - ۱۹۸۰ میں) شائع ہوئیں۔

۵۔ مولانا فراہی کے فلسفہ نظم قرآن پر تفصیلی مطالعہ کے لئے ملاحظہ کریں ان کی عربی کتاب، دلائل النظام، دائرہ حمیدیہ، سرائے میر ۱۹۶۸ء، امین احسن اصلاحی، نظم قرآن در: قرآنی مقالات، ص ۲۳ - ۳۴، علیم اللہ خاں سدھارتی۔ علامہ فراہی کے نظام قرآن کی خصوصیت، سالانہ مجلہ انجمن طلبہ مدرسۃ الاصلاح، شمارہ نمبر ۲، ۱۹۹۳ء ص ۳۰ - ۳۷

۶۔ تدبر قرآن کے تعارفی مطالعہ کے لئے دیکھیں: ظفر الاسلام اعظمی، "تدبر قرآن" ایک مطالعہ، ششماہی علوم القرآن، ۵/ ۱ جنوری، جون، ۱۹۹۰ء ص ۸۱ - ۹۶، ابو سفیان اصلاحی، تدبر قرآن میں سورتوں کے گروپ کا ایک جائزہ، ۲/۳۳، ۱۹۹۷ء، ص ۳۲ - ۵۲

۷۔ "کوہیرنس ان دی قرآن" ادارہ علوم القرآن، علی گڑھ کی لائبریری میں دستیاب ہے۔ اس کتاب پر پروفیسر عبید اللہ فراہی کے تبصرہ کے لیے ملاحظہ کریں ششماہی علوم القرآن، ۴/ ۲، جولائی۔ دسمبر ۱۹۸۹ء ص ۱۳۰ - ۱۳۱

۸۔ یہ کتاب ادارہ علوم القرآن (سرسید نگر، علی گڑھ) سے بھی مولانا سلطان احمد اصلاحی کی تخریج و تحقیق کے ساتھ ۱۹۸۵ء میں شائع ہوئی ہے۔

۹۔ اس کتاب کے تفصیلی مطالعہ کے لئے ملاحظہ فرمائیں: ابو سفیان اصلاحی، فلسفے کے بنیادی مسائل قرآن حکیم کی روشنی میں۔ مولانا امین احسن اصلاحی کا نقطہ نظر، علوم القرآن، ۷/۱، جنوری، جون ۱۹۹۲ء ص ۱۰۵ - ۲۲۴

۱۰۔ ماہنامہ الاصلاح، میثاق و تدبر کے قرآنی مضامین کے اشاریہ کے لئے ملاحظہ فرمائیں: ابو سفیان اصلاحی، قرآنی مضامین کا اشاریہ، علوم القرآن، ۱/ ۳ جولائی۔ دسمبر ۱۹۸۶ء ص ۱۳۰ - ۱۵۰، ۱/۳، جنوری، جون ۱۹۸۹، ص ۱۵ - ۳۰، ۲/۳، جولائی۔ دسمبر ۱۹۸۹ء ص ۱۰۹ - ۱۱۹

۱۱۔ "حلقہ تدبر قرآن" کے قیام کے پس منظر اور اس کی کارکردگی کی تفصیلات کے لئے دیکھیں مولانا امین احسن اصلاحی کے دو مضامین: حلقہ تدبر قرآن، حلقہ تدبر قرآن کی رفتار کار در مقالات اصلاحی (ترتیب خالد مسعود)، فاران فاؤنڈیشن، لاہور ۱۹۹۱ء، ص ۳۱۳ - ۳۲۱، ۳۲۲ - ۳۲۷

۱۲۔ مولانا امین احسن اصلاحی" کے وفات پا جانے والے تلامذہ کے حالات کے لئے ملاحظہ فرمائیں سالانہ مجلہ انجمن طلبہ مدرسۃ الاصلاح (مرحوم اصلاحی شخصیات نمبر) شمارہ نمبر ۵، ۱۹۹۶ء)

سلیم کیانی

# فکر قرآنی کا رازداں

نامور مفکر اسلام مولانا امین احسن اصلاحی 93 سال کی عمر میں 15/ دسمبر 1997ء کو لاہور میں انتقال کر گئے۔ علوم قرآن' خاص طور پر نظم قرآن کھولنے کے لئے ناقابل فراموش خدمات نے انہیں زندہ جاوید کر دیا ہے۔ تاریخی اعتبار سے بعض قدیم اور جدید مفکرین کی تحریروں میں شروع ہی سے قرآن کے ایک مربوط کتاب ہونے کا تصور موجود رہا ہے لیکن عصر حاضر میں نامور مفکر اور مولانا اصلاحی کے استاد امام حمید الدین فراہی" نے سب سے پہلے اس کو اپنی مجتہدانہ فکر کا محور بنایا اور اپنے نتائج فکر کو باضابطہ قلمبند کیا۔

مولانا اصلاحی" ' مولانا فراہی" کے سب سے ہونہار شاگرد تھے جو بعد میں مدرستہ الاصلاح کے صدر مدرس بھی مقرر ہوئے۔ یہ مدرسہ مولانا شبلی نعمانی اور مولانا فراہی نے قائم کیا تھا۔ مولانا اصلاحی نے قرآن مجید پر تدبر اور تلاش نظم کے طریقے اپنے استاد سے سیکھے اور اسی مکتب فکر کے اہم ترین داعی اور شارح بن گئے۔ مولانا فراہی نے اپنے پیچھے صرف چند متفرق تحریریں چھوڑیں جن میں سے بیشتر عربی میں ہیں' اس لئے عام قاری کی ان تک رسائی ممکن نہیں۔ لیکن ان کے نامور شاگرد نے نظم قرآن کے اصولوں کو ترقی دی اور شرح و بسط کے ساتھ بیان کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی بنیاد پر نو جلدوں میں اپنی یادگار تفسیر "تدبر قرآن" لکھی۔

مولانا اصلاحی یوپی (بھارت) کے ضلع اعظم گڑھ کے گاؤں بمہور میں 1904 میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے دینی تعلیم کے مروجہ نظام کے تحت قرآن و حدیث اور عربی زبان و ادب کی اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ اپنے متعدد ہم عصر مفکرین کی طرح وہ بھی ہندوستان کی تحریک آزادی سے متاثر ہوئے اور کچھ عرصہ تک کانگریس پارٹی کی مقامی شاخ کے صدر بھی رہے۔

دوسرے علماء کی طرح برطانوی سامراج سے ہندوستان کی آزادی' جس کے معنی مسلمانوں کی آزادی بھی تھی' ان کے نزدیک بھی بڑی اہمیت کی حامل تھی۔ 1930ء کے عشرہ کی ابتداء میں مولانا مودودی نے کانگریس اور مسلم لیگ کی قومی سیاست کو ہدف تنقید بنایا اور ایک اسلامی جماعت بنانے کی دعوت دی جو اسلام کو مکمل ضابطہ حیات کے طور پر پیش کرے۔ اسی بنیاد پر 1941ء میں جماعت اسلامی قائم ہوئی۔ مولانا اصلاحی اس کے بنیادی ارکان میں شامل تھے۔ بعد میں جب بعض لوگ معمولی اختلافات کی وجہ سے جماعت اسلامی سے الگ ہو گئے تو مولانا اصلاحی نے یوں تبصرہ کیا کہ میں ایسا سودائی نہیں ہوں کہ مودودی کی داڑھی کی لمبائی کے مسئلہ پر اسلام کا مستقبل خطرہ میں ڈال دوں۔

جماعت اسلامی میں مولانا اصلاحی کو مولانا مودودی کے نائب کی حیثیت حاصل تھی۔ انہیں مولانا



مودودی کا جانشین سمجھا جاتا تھا۔ مولانا ایک شعلہ بیان خطیب بھی تھے۔ اگرچہ وہ جماعت اسلامی کی انتخابی مہموں میں بے حد فعال رہے لیکن انہیں سیاست سے طبعی مناسبت نہیں تھی' یہاں تک کہ جب وہ جماعت اسلامی میں انتہائی سرگرم بھی تھے تب بھی سیاست نے انہیں کچھ مزہ نہ دیا۔ پالیسی کے بعض اختلافات کی وجہ سے وہ 1958 میں جماعت اسلامی سے الگ ہو گئے۔ مولانا اصلاحی" اسلامی انقلاب کے لئے انتخابی سیاست کو ایک سعی لاحاصل سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ سیاستدان کبھی اسلام نافذ نہیں کر سکتے کیونکہ ان کا مقصد وحید ہر جائز و ناجائز طریقہ سے اقتدار کا حصول ہوتا ہے' اور اگر بعض لوگ اسلام کا نام لیتے ہیں تو وہ اپنے سیاسی مقاصد کے لئے ایسا کرتے ہیں۔

مولانا کے نزدیک اسلامی دعوت کا انحصار تبلیغ اور حق کی عملی و قولی شہادت پر ہے جبکہ سیاستدان اپنے اغراض کے لئے پروپیگنڈہ کا ہتھیار استعمال کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

> "پروپیگنڈہ اور تبلیغ میں صرف انگریزی اور عربی ہی کا فرق نہیں ہے بلکہ روح اور جوہر کا بھی فرق ہے۔ تبلیغ تو صرف اللہ کے دین کو پورا پورا پہنچا دیتا ہے۔ لیکن پروپیگنڈے کا مقصد پیش نظر تحریک کو کامیاب بنانا ہوتا ہے' یہ کامیابی جس طرح بھی حاصل ہو۔ پروپیگنڈا ایک مستقل فن ہے جس کو زمانہ حال کی سیاسی تحریکات نے جنم دیا ہے۔ اور اس کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہ ان تمام اخلاقی حدود و قیود سے بالکل آزاد ہوتا ہے جن کی پابندی حضرات انبیاء علیہم السلام نے اپنے اقامت دین کے کام میں واجب سمجھی ہے۔۔۔۔۔
>
> جھوٹ اور مبالغہ آرائی کو موجودہ زمانہ میں ہمارے اہل سیاست نے اس طرح اوڑھنا بچھونا بنا لیا ہے کہ اب اس کے برائی ہونے کا شائد لوگوں کے اندر احساس بھی مردہ ہو گیا ہے۔ اس کوچہ میں بدنام تو اکیلا غریب گوئبلز ہے لیکن حقیقت اور انصاف یہ ہے کہ اس سیاست کے حمام میں سب کو گوئبلز ہی کے اسوہ کی پیروی کرنی پڑتی ہے' خواہ کوئی شخص دنیا کا نام لیتا ہوا اس میں داخل ہو یا دین کا کلمہ پڑھتا ہوا داخل ہو"۔

(اقامت دین کے لیے انبیاء کا طریق کار۔ مقالات اصلاحی حصہ اول) (ص 282 ۔ 283)

مولانا اصلاحی تجویز کرتے ہیں کہ جو لوگ اسلام اور اس کے احیاء کے لئے کام کرنا چاہتے ہیں انہیں اقتدار کی خواہش اور ووٹوں کے حصول سے بے نیاز ہو کر اور سیاسی جوڑ توڑ میں حصہ لیے بغیر عوام میں بے لوث کام کرنا چاہیے۔ انہیں عوام کی خدمت' ان کی تعلیم اور اسلام کے مطابق تعمیر افکار و کردار کے لئے عوام سے رابطہ کرنا چاہیے۔

ان کے خیال میں پاکستانی معاشرہ فتراق و انتشار کا شکار ہے۔ اس کو سب سے خطرناک بیماری نفاق کی لاحق ہے۔ اسی لئے انہوں نے اس رائے سے اختلاف کیا کہ اگر آزادانہ اور منصفانہ انتخابات ہوئے تو عوام اسلام اور اسلامی جماعتوں کو ووٹ دیں گے۔

قیام پاکستان کے فوراً بعد جب حکمران پاکستان کو مثالی اسلامی ریاست بنانے کے وعدہ سے مکرنے لگے تو مولانا اصلاحی نے لکھا "نفاق انسان کی ایک مہلک بیماری کی حیثیت سے تو ضرور متعارف ہے اور ہر دور اور ہر سوسائٹی میں ایسے افراد و اشخاص پیدا ہوتے رہے ہیں جو اس بیماری میں جتلا ہوئے لیکن ہمیں تاریخ میں کسی ایسی قوم کا سراغ نہیں ملتا جس کے لیڈروں نے متفق ہو کر نفاق کو قومی پالیسی کی حیثیت سے اختیار کیا ہو اور اس کو اپنی مشکلات کی کلید جانا ہو۔ پوری تاریخ انسانیت میں اس قسم کی کوئی قوم اگر ملتی ہے تو صرف ایک قوم ملتی ہے اور وہ بدقسمتی سے ہماری قوم ہے"۔

مولانا نے اپنی کتاب "اسلامی معاشرہ میں عورت کا مقام" میں ان خطرات کی نشاندہی کی ہے جو پاکستانی قیادت کی اس شترگربگی میں مضمر ہیں جس کا اظہار قوانین اور خاندانی نظام کے متعلق ان کے رویہ سے ہوتا ہے اور جو ان کے نفاق کی بدترین مثال ہے۔ انہوں نے لکھا ہے "ہمارے نزدیک صحت مند قومی زندگی کے لئے ناگزیر ہے کہ قوم کے ارباب کار قوم کو جس راستہ پر لے جانا چاہتے ہوں پوری یکسوئی اور پورے عزم کے ساتھ اسی راستہ کی طرف بلائیں اور اسی پر اس کو چلائیں۔ ایک راستہ پر قوم کو چلانا اور دوسرے راستہ کے مناظر کی دلکشیوں کی داستان سرائی کرنا نہایت ہی احمقانہ طریقہ ہے جس سے نقصان کے سوا کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا"۔

مولانا اصلاحی نے پاکستانی معاشرہ کا جو تجزیہ کیا اس کی روشنی میں وہ یہ سمجھتے تھے کہ اس معاشرہ کو ایک متحرک ترقی یافتہ اسلامی معاشرہ میں تبدیل کرنے کے لئے اصلاح کی کوئی سطحی کوششیں کامیاب نہیں ہو سکتیں۔ مولانا مودودی کی طرح ان کی رائے بھی یہی تھی کہ اس تبدیلی کے لئے قرآنی تعلیمات کی رہنمائی میں اسلام کے حق میں ذہنی و فکری تبدیلی شرط اولین ہے۔

مولانا اصلاحی نے خود یہ مشاہدہ کیا تھا کہ جماعت اسلامی اور مولانا مودودی پاکستانی سیاست میں کیسے اور کتنی جلدی کھو گئے حالانکہ انہوں نے ابتداء سے ایک مکمل ذہنی و فکری انقلاب کے لئے ایک طویل المیعاد منصوبہ بنایا تھا۔ اس میں علم کی تمام شاخوں اور ہر ہر شعبہ میں تبدیلی کو حقیقی اسلامی انقلاب کے لیے لازمی شرط قرار دیا گیا تھا۔

مولانا نے اسی خطرہ سے بچنے کے لیے جماعت اسلامی سے علیحدگی کے کچھ ہی عرصہ بعد پوری لگن اور اخلاص سے اپنے آخری ذہنی سفر کا وہیں سے آغاز کیا جہاں سے مولانا مودودی اور جماعت اسلامی نے اس کو ترک کر دیا تھا۔ انہوں نے اپنا سارا وقت اور توانائیاں قرآن پر غور و فکر، اپنے شاگردوں کو قرآن



سکھانے اور اپنی شاہکار تفسیر تدبر قرآن کی تکمیل پر مرکوز کر دیں۔ ان کا خیال تھا کہ تدبر قرآن مستقبل میں اسلام پر کام کرنے کے لئے رہنمائی کا کام دے گی۔

عمر عزیز کے سترہ سال جماعت اسلامی میں کھپانے کے بعد اس سے الگ ہونا مولانا کے لئے بڑا تکلیف دہ تجربہ تھا لیکن وہ ان دینی مقاصد کے نہایت ثابت قدمی کے ساتھ وفادار رہے جن کے لئے وہ جماعت اسلامی میں شامل ہوئے تھے۔ علیحدگی کے بعد انہیں اپنی حیثیت اور اپنی صلاحیتوں نیز معاشرہ کی ضروریات کا از سر نو جائزہ لینے کا موقع ملا اور انہوں نے اپنی زندگی کے اہم ترین کام پر تمام توجہات مرکوز کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ تھا پوری دنیا میں اسلام کی حقیقی نشاۃ ثانیہ کا راستہ ہموار کرنے کے لئے قرآن کے پیغام کی مربوط طریقہ سے وضاحت اور تشریح۔ پچھلے چند برسوں میں اندرون ملک اور بیرون ملک، جس میں مغرب بھی شامل ہے، تعلیم یافتہ طبقوں میں ان کے افکار اور قرآن مجید پر تدبر کے طریقوں کی جو پذیرائی ہوئی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کا اندازہ غلط نہیں تھا۔

راقم 1963ء میں مولانا کے قائم کردہ حلقہ تدبر قرآن میں شامل ہوا تو اس وقت وہ عجلت میں دکھائی دیتے تھے۔ انہیں یقین نہیں تھا کہ کام کرنے کی کتنی مہلت باقی رہ گئی ہے۔ وہ اس بات سے فکرمند تھے کہ ان کے استاد امام نے جو امانت ان کے سپرد کی ہے کہیں وہ ہمیشہ کے لئے ضائع نہ ہو جائے۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے "میری باتیں غور سے سن لیا کرو۔ بعد میں جگالی کرنے اور غور و فکر کے لئے تمہارے پاس کافی وقت ہو گا"۔

مولانا قرآن پر تدبر میں پوری طرح منہمک رہتے۔ ان کے شاگردوں کو ان کی اس ریاضت سے بڑا فائدہ ہوتا۔ ان کی ہدایت یہ ہوتی "ایک سورۃ کا اس وقت تک مطالعہ کیا کرو کہ جب تم اپنی آنکھیں بند کرو تو پوری سورہ کا سراپا، اس کے شروع سے آخر تک، اپنے پورے جمال کے ساتھ تمہارے ذہن کے سامنے آجائے"۔

میں سات برس تک ان سے مستفیض ہوا۔ اس دوران میں میں نے مولانا اصلاحی کو انتہائی حساس، بامروت، ہمدرد، شفیق، بے تکلف لیکن دلیل کو ماننے والا، گرم جوش محبت کرنے والا پایا۔ جو بھی ان سے ملنے آتا یہ محسوس کرتا کہ مولانا اس کو اہمیت دے رہے ہیں اور پوری توجہ اس پر صرف کر رہے ہیں۔ نہ تو وہ لوگوں کو گھرکتے اور نہ ہی انہیں بے وقعت سمجھتے۔ شعر و ادب، عمرانیات اور انسانی نفسیات پر انہیں اتنی دسترس حاصل تھی کہ کسی بھی بحث یا بظاہر بے معنی سوال کے نتیجہ میں وہ علم کا ایسا دریا بہا دیتے کہ وہ ایک یادگار تجربہ بن جاتا جس کی لذت کافی عرصہ تک باقی رہتی۔

مولانا اصلاحی 1925 میں نامور مفکر قرآن مولانا حمید الدین فراہیؒ کی سرپرستی میں آئے جس سے ان کی زندگی کا دھارا تبدیل ہو گیا۔ پانچ برس تک انہوں نے اپنے استاد سے قرآن کا اندرونی نظم سیکھا اور اس

پر غور و فکر اور اس کے اندر مخفی حکمت کے فہم تک رسائی کے لیے ان کے طریق کار میں مہارت حاصل کی۔ مولانا فراہی" کے بقول اس کا خلاصہ قرآن کا بے مثال نظام اور ربط ہے۔

قرآن میں نظم اور اس کی سورتوں کا آپس میں ربط ہونا کوئی نئی بات نہیں ہے۔ اس کی روایت نبی کریمؐ تک پہنچتی ہے جن کے پاس ہر سال رمضان میں جبریل امینؑ آتے اور قرآن کا مذاکرہ کرتے تھے۔ اسی طرح جب حضورؐ پر کوئی وحی نازل ہوتی تو آپؐ صحابہ کرامؓ کو ہدایت کرتے کہ اس کو قرآن میں کس جگہ رکھا جائے۔ چنانچہ قران مجید کا ایک مرتب کتاب ہونا اور اس میں معین داخلی نظم کا پایا جانا ایک معلوم حقیقت ہے جس کو ابتداء ہی سے سب مانتے چلے آئے ہیں۔

اس کے باوجود نظم کی تلاش اور ہر زمانہ کی ضروریات کے مطابق اس کی توضیح ہمیشہ ایک مشکل اور محنت طلب کام رہا ہے۔ امام فراہی" اور مولانا اصلاحی" دونوں یہ سمجھتے تھے کہ ان کے پیشروؤں نے قرآن کے اس پہلو پر زیادہ توجہ نہیں دی حالانکہ ان کی رائے میں قرآن کے پیغام اور اس کی حکمت کو سمجھنے کے لئے یہ انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ ایک مرتبہ جب خود انہیں اس کی اہمیت کا احساس ہو گیا تو فراہی" اور اصلاحی" دونوں نے قرآن کے عجائبات کو سمجھنے اور سمجھانے کے لئے اپنی زندگیاں وقف کر دیں۔

مولانا حمید الدین فراہیؒ کو نظم قرآن کے اس خاص پہلو میں سب سے پہلے دلچسپی اس وقت پیدا ہوئی جب وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں پڑھتے تھے۔ انہوں نے اس کے اصولوں کے متعلق عربی زبان میں لکھا اور ان کی بنیاد پر بعض سورتوں کی تفسیر کی۔ کچھ سورتوں کی تفسیر کا مولانا امین احسن اصلاحی نے اردو میں ترجمہ کیا جو مجموعہ تفاسیر فراہی کے نام سے شائع ہوا۔

مولانا فراہی" نے جو کچھ لکھا وہ علماء کے لئے لکھا جس کی عالمانہ زبان کو سمجھنا بیشتر قارئین کی رسائی سے باہر ہے۔ مولانا اصلاحی" نے اپنے عظیم استاد کے ناتمام کام کو انہی کے طریق کار اور اصولوں کی بنیاد پر پورے قرآن کی تفسیر لکھ کر پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ انہوں نے اردو زبان میں اپنی تفسیر تدبر قرآن 1958ء میں لکھنا شروع کی اور 1980ء میں اسے مکمل کیا۔ ان کا 23 سال کا یہ کام چھ ہزار صفحات پر محیط ہے۔

اپنی تفسیر میں مولانا اصلاحی" نے اپنے استاد کو جگہ جگہ خراج عقیدت پیش کیا اور لکھا ہے کہ یہ سب کچھ ان کے استاد کا صدقہ ہے اور اس تفسیر کا سہرا فراہی" کے سر ہے۔ فی الحقیقت اصلاحی" نے اپنے استاد سے جو کچھ سیکھا تھا اس میں بہت کچھ اضافہ کیا۔ امام فراہی" نے چند ابتدائی خیالات اور اصول بیان کئے تھے لیکن انہیں ان کی تشریح و توضیح صحیح معنوں میں کرنے کا موقع نہیں مل سکا تھا۔

مولانا اصلاحی" کی اس عظیم کامیابی ان کا اسلوب اور ان کی زبان ہے جو عالمانہ لیکن قابل فہم ہے' جس سے تعلیم یافتہ لوگ آسانی سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ اس کام کی پیچیدگی کو مد نظر رکھا جائے تو یہ کوئی معمولی کامیابی نہیں۔ تفسیر میں وہ اپنے استاد کا بار بار جو حوالہ دیتے ہیں اس سے نہ صرف استاد کے لیے ان



کی بے پناہ محبت اور احترام کا اظہار ہوتا ہے بلکہ یہ خود ان کے خلوص اور انکساری کی دلیل ہے۔

مولانا اصلاحی" کے بقول ان کی تفسیر ان کی اور ان کے استاد کی ایک صدی کی محنت اور غور و فکر کا ثمرہ ہے۔ مولانا فراہی" نے قرآن پر غور و فکر کا کام علی گڑھ سے شروع کیا اور تیس پینتیس سال تک تا عمر جاری رکھا۔ مولانا اصلاحی" کا کہنا ہے کہ 55 سال تک قرآن ہی ان کے غور و فکر اور مطالعہ کا محور رہا ہے۔ اس طرح یہ تفسیر استاد اور شاگرد دونوں کی تقریباً سو سالہ ریاضت کا ثمرہ ہے۔

مولانا اصلاحی" کا طریقہ قرآن مجید پر براہ راست غور و فکر کا ہے۔ فراہی" اور اصلاحی" دونوں قرآن کی تفسیر قرآن ہی سے کرتے ہیں۔ وہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ قرآن کو اس کی زبان' عربی کے ان محاوروں (جاہلی ادب) کے ذریعہ سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے جو نزول قرآن کے موقع پر مستعمل تھے۔ اس کے علاوہ قرآن کے نظائر کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ نیز یہ حقیقت بھی ملحوظ ہونی چاہیے کہ قرآن اپنے معانی و مطالب کو مختلف انداز میں اور مختلف پیش و عقب کے ساتھ دوسری جگہ کھول دیتا ہے۔ خود قرآن کا کہنا ہے:

> "یہ ایک ایسی کتاب ہے جس کی آیتیں پہلے محکم کی گئیں پھر خدائے حکیم و خبیر کی طرف سے ان کی تفصیل کی گئی"۔ (ہود ۔ 1)

سب سے بڑھ کر یہ کہ تدبر کے اس طریقہ کا محور قرآن کا داخلی نظم ہے اور تفسیر کا بنیادی خیال اسی کی تعبیر و تشریح ہے۔

مولانا اصلاحی" کے نظم قرآن کے تصور کے مطابق ہر سورہ زوج زوج ہے۔ ان میں ایسی ہی مناسبت ہے جیسی زوجین میں ہوتی ہے۔ ہر سورہ ایک مربوط وحدت ہے جس کا ایک معین عمود ہے۔ اس کی ایک تمہید ہوتی ہے جس کے بعد اس کے پیغام کی تشریح اور اس کے حق میں دلائل بیان ہوتے ہیں اور آخر میں خاتمہ کلام کی آیات ہوتی ہیں۔ جس طرح ایک سورہ کے اندر تمام آیات باہم مربوط اور ایک دوسری کے ساتھ جڑی ہوتی ہیں اسی طرح تمام سورتیں باہم دگر مربوط ہیں۔ مولانا اصلاحی قرآن مجید میں سورتوں کے سات گروپوں کی نشاندہی کرتے ہیں۔ ہر گروپ کا ایک خاص عمود ہے' اس کا اپنا ایک مزاج ہے جس میں بڑی فصاحت اور بلاغت سے عمود کی تشریح کی گئی ہے۔

مولانا اصلاحی" کا کہنا ہے کہ قرآن کی سات گروپوں میں تقسیم خود قرآن سے ثابت ہے۔ اس کے ثبوت میں انہوں نے اس آیت کا حوالہ دیا ہے۔

> "ہم نے تم کو سات مثانی اور قرآن عظیم عطا کئے" (حجر ۔ 87)

مولانا کے نزدیک یہ آیت ان سات گروپوں کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ اس سے بار بار دہرائی جانے والی سات آیات (سورہ فاتحہ) مراد نہیں' جیسا کہ عام طور پر سمجھا گیا ہے۔ اس طرح مولانا اصلاحی اپنے عظیم

شاہکار تدبر قرآن میں نظم قرآن کی وضاحت کو سب سے زیادہ اہمیت دیتے ہیں' کیونکہ یہی قرآن پر تدبر کا سب سے اہم عنصر ہے۔ ہر سورہ کی تفسیر کے آغاز میں اس کے عمود کی وضاحت اور اس کے مطالب کا تجزیہ دیا گیا ہے۔

مولانا اصلاحیؒ اس یقین کا اظہار کرتے ہیں کہ انہوں نے تفسیر میں جو اصول بیان کئے ہیں وہ سائنٹفک اور عقلی ہیں جن کی بنیاد عقل عام پر ہے۔ ان کے بغیر قرآن کا اصل جمال اور اس کی حکمت سمجھ میں نہیں آسکتی۔ تفسیر کے دیباچہ میں انہوں نے لکھا:

> یہ کتاب میں نے شوق تصنیف کے جذبے کے تحت نہیں بلکہ مجرد ادائے فرض کے احساس سے مجبور ہو کر لکھی ہے۔ "قرآن تو موجود ہے لیکن اس کا علم ہمارے اندر موجود نہیں ہے۔ اس وقت یہ یا تو حصول ثواب اور ایصال ثواب کی چیز بن کے رہ گیا ہے یا تجارت کی۔ اور جو جتنی ہی بلند آہنگی سے اس کا نام لیتا ہے وہ اتنا ہی زیادہ اس سے محروم و ناآشنا نظر آتا ہے۔ اگر اس امت کو بحیثیت امت مسلمہ زندہ رکھنا ہے تو یہ کام نہ وحدت امت کی مالا جپنے سے ہو گا نہ قرآن کا وظیفہ پڑھنے سے' بلکہ اس کے لیے سب سے مقدم شے قرآن کے صحیح علم کو اجاگر کرنا ہے۔ جن کے اندر اس کا صحیح علم ہو گا انہی کے اندر صحیح عمل پیدا ہو گا اور اس امت کی جب بھی اصلاح ہو گی انہی کے مبارک ہاتھوں سے ہو گی"۔

راقم الحروف سمیت جن لوگوں نے مولانا سے قرآن سیکھا ہے ان کے تجربات کی روشنی میں بلا تامل کہا جا سکتا ہے کہ مولانا اصلاحی نے اپنے شاگردوں کو قرآن کا داخلی نظم اور ربط سکھا کر ایسے خزانہ کی شاہ کلید عطا کر دی ہے جو کبھی ختم نہیں ہو سکتا۔ انہوں نے کتاب اللہ کو سمجھنے کے لئے اصول اور قواعد سکھا دیئے جن کے ذریعہ سے اس کتاب کی حکمتوں اور عجائبات کے اسرار منکشف ہو سکتے ہیں۔ مولانا اصلاحیؒ زرخیز ذہن کے مالک تھے۔ انہوں نے بلند پایہ سولہ کتب تحریر کیں۔

پنجاب میں 1951ء میں قادیانیوں کے خلاف تحریک کے دوران' مولانا اصلاحیؒ مولانا مودودیؒ اور میاں طفیل محمد کے ہمراہ راولپنڈی اور ملتان کی جیلوں میں قید رکھے گئے۔ 1956ء میں جب حکومت پاکستان نے اسلامک لاء کمیشن قائم کیا تو مولانا اصلاحیؒ' جو اسلامی قانون کے بھی بڑے ماہر تھے' کمیشن کے رکن مقرر ہوئے اور وہ اس وقت تک اس حیثیت میں کام کرتے رہے جب تک کہ 1958ء میں جنرل ایوب خان کے مارشل لاء کے دور میں اس کمیشن کو ختم نہیں کر دیا گیا۔

مولانا امین احسن اصلاحیؒ نے اپنے پیچھے دو بیٹے ابوسعد اور ابوسعید اور دو بیٹیاں چھوڑی ہیں۔ انہوں نے ہونہار شاگردوں کی ایک ایسی جماعت بھی چھوڑی ہے جو ان کے اعلیٰ مشن کو جاری رکھنے کا عزم رکھتی ہے۔



محبوب سبحانی

# دیدۂ بینا

مولانا امین احسن اصلاحیؒ نہ صرف یہ کہ ایک نابغہ روزگار عالم دین' عظیم اور منفرد مفسر قرآن' قرآن مجید کے نکتہ رس' حدیث اور فقہ کے عالم بے بدل اور صاحب طرز ادیب و انشاء پرداز ہیں بلکہ وہ ایک عظیم فلسفی بھی ہیں جنہوں نے تمام بڑے فلسفیوں کے نظریات کا محاکمہ کر کے بتایا کہ ان کی رائے کہاں تک درست ہے اور کہاں ان سے غلطی ہوئی ہے۔ انہوں نے مولانا حمید الدین فراہیؒ سے قرآن کا علم حاصل کیا تو وہیں فلسفہ میں بھی ان سے رہنمائی حاصل کی۔ انہوں نے تمام بڑے فلسفیوں کو بڑے اہتمام سے پڑھا۔ وہ سقراط کی باتوں کو عقل و فطرت کے مطابق پاتے تھے۔ اس کے حکیمانہ سوالوں میں وہ اپنے ذہن کی الجھنوں کو تلاش کرتے تھے۔ وہ اس کے طریق کار کو قرآن مجید کے انداز کے مطابق پاتے تھے کیونکہ قرآن بھی انسان کی غور و فکر کی صلاحیتوں ہی کو بیدار کرنا چاہتا ہے۔ سقراط کے شاگردوں کے فلسفہ سے وہ پوری طرح مطمئن نہ تھے۔

اپنے دور طالب علمی میں مولانا رواقیوں (STOICS) کے فلسفہ سے بے حد متاثر تھے جو ضبط نفس کی تعلیم دیتا اور کہتا ہے کہ ہر رنج و الم کو انگیز کرنا چاہیے اور حرف شکایت زبان پر نہیں لانا چاہیے۔ مولانا بتاتے کہ میں مارکس آریلیس (MARCUS AURELIUS) کی تحریریں پڑھ پڑھ کر رو دیا کرتا تھا۔ یہ رومن شہنشاہ خدا کو عقل محض مانتا اور انکساری اور ترک دنیا کو فضائل میں شمار کرتا ہے۔ مولانا کے مطابق ان کے استاد مولانا حمید الدین فراہیؒ کو جب ان کی اس کیفیت کا علم ہوا تو انہوں نے رواقی فلسفہ پر تقریر کی جس کے بعد ان کے دل کو قرار آگیا۔ مولانا کہتے تھے کہ جب میں نے (TRIAL AND DEATH OF SOCRATES) کتاب پڑھی تو میں سقراط کی بے عیب زندگی' اس کے اخلاق اور علم و فلسفہ سے بے حد متاثر ہوا۔ مجھے اس کی زندگی اور موت نبیوں سے بڑی مشابہ نظر آئی۔ اس نے زہر کا پیالہ بھی توحید ہی کی خاطر پیا' لہٰذا عین ممکن ہے کہ وہ اپنے دور کا نبی رہا ہو جسے دلچسپی اپنی قوم کا اخلاق سنوارنے سے رہی ہو۔ مولانا عمانوئیل کانٹ (IMMANUEL KANT) کے بھی قائل تھے جس کا کہنا ہے کہ سائنس سے بھی بلند تر ایک حقیقت موجود ہے اور وہ انسان کا اخلاقی وجود ہے' نیز انسان کے اندر نیکی و بدی کا شعور موجود ہے۔

مولانا کے نزدیک فلسفہ کو انسانی ذہن میں پیدا ہونے والے ان سوالوں کا جواب فراہم کرنا چاہیے کہ میں کون ہوں' کہاں سے آیا ہوں' اس کائنات سے میرا کیا تعلق ہے' میرا میرے ہی جیسے انسانوں سے کیا تعلق ہے' میرا خالق کون ہے' کیا میں بااختیار ہوں یا مجبور' اچھائی کیا ہے اور برائی کیا۔ یہ اور اس قسم کے

متعدد دوسرے سوالات پر ہر زمانہ کے اعلیٰ دماغ لوگوں نے غور و فکر کرکے اپنی آراء کا اظہار کیا ہے اور یہی اصل فلسفہ ہے۔ دور حاضر کے فلسفی ان مسائل سے بے تعلق ہو گئے ہیں اس لئے مولانا ان کو اہمیت دینے کے لیے تیار نہیں ہوتے تھے۔

مذکورہ سوالات کا انسان کی زندگی' اس کے عمل اور رویہ سے جتنا گہرا اور بنیادی تعلق ہے فلسفیوں نے اس کو اتنا ہی پیچیدہ' مشکل اور بوجھل بنا دیا ہے۔ وہ اپنے خیالات کو ایسی اصطلاحات میں پیش کرتے ہیں جن کا سمجھنا آسان نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عام آدمی کے لئے فلسفہ کی افادیت مشکوک ہو گئی۔ مزید برآں فلسفیوں کی آراء میں بہت زیادہ اختلافات کی بناء پر کسی ایک رائے کو اختیار کرنا مشکل تر ہو گیا' اس لئے فلسفہ محض ذہنی عیاشی بن کر رہ گیا اور اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں کے لئے بھی یہ گورکھ دھندے سے کم نہیں رہا۔ مولانا امین احسن اصلاحی" واحد شخصیت ہیں جنہوں نے فلسفیانہ اصطلاحات کا سہارا لیے بغیر فلسفہ کے تمام بنیادی مسائل عام فہم اور شگفتہ زبان میں بیان کیے۔ ان کو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کا جو فہم عطا فرمایا تھا اس سے انہوں نے کسوٹی کا کام لیا۔

مولانا کا فلسفیانہ فکر ان کی کتاب حقیقت شرک' حقیقت توحید اور ان کی معرکہ آرا تفسیر تدبر قرآن میں بیان ہوا ہے جس میں انہوں نے موقع و محل کے اعتبار سے متعلقہ آیات کی تفسیر کرتے ہوئے کہیں اجمالاً اور کہیں تفصیلاً قرآن کا نقطہ نظر بیان کیا ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے اپنی ایک کتاب "فلسفہ کے بنیادی مسائل قرآن حکیم کی روشنی میں" جو ان کے لیکچرز کا مجموعہ ہے' میں فلسفہ کے چھ بنیادی سوالات کا شافی جواب دیا ہے۔ ان سوالات میں خدا کی ذات و صفات' کائنات میں انسان کا مقام' خیر و شر' جبر و اختیار' آخرت اور جزا و سزا' اور نظام نبوت شامل ہیں۔

## مذہب کی بنیاد

مولانا وہ پہلے فلسفی ہیں جنہوں نے مغربی فلسفیوں کی اس رائے کو مسترد کر دیا کہ مذہب کی بنیاد خوف ہے۔ انہوں نے خوف کا تجزیہ کرکے بتایا کہ خوف تو زوال نعمت کا ہوتا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ خوف سے پہلے نعمت کا شعور موجود ہوتا ہے۔ اگر نعمت کا شعور موجود ہے تو منعم کا شعور موجود ہونا بھی ضروری ہے۔ یہ شعور انسان کے اندر منعم کے لئے شکر کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔ اس لئے یہی جذبہ شکر و امتنان اور منعم سے محبت ہی مذہب کی بنیاد ہے۔ فلسفیوں نے خوف کی بنیاد یہ بیان کی ہے کہ ابتدائی انسان کو بجلی کی کڑک' بادلوں کی گرج' طوفانوں' سیلابوں' زلزلوں اور دوسری آفات کی تباہ کاریوں سے خوف پیدا ہوا اس لئے اس نے ان قوتوں کو راضی رکھنے کے لیے ان کی پرستش شروع کر دی۔ مولانا نے اس دلیل کے جواب میں فلسفیوں کے مشاہدہ کی غلطی واضح کی اور بتایا کہ زلزلے' طوفان اور سیلاب روزمرہ کے واقعات نہیں ہیں۔ جبکہ سورج کا نکلنا' چاندنی کا چھٹکنا' پانی کا برسنا' فصلوں کا لہلہانا' چڑیوں کا چہچہانا' پھولوں کا مسکرانا' سبزہ کا



اگنا' ابر کی تردستیاں' درختوں کی ثمرباریاں ہر موسم میں اور ہر روز موجود ہیں۔ حیرت کی بات ہے کہ مظاہر قدرت کی گاہ گاہ کی گھرکیاں اور دھمکیاں تو انسان کو اس درجہ مرعوب کر دیں کہ وہ ان کی پوجا کرنے لگ جائے لیکن منعم غیب کی یہ ساری فیاضیاں بالکل بے اثر رہ جائیں اور انسان کے اندر شکر و سپاس کا کوئی ولولہ پیدا نہ کریں۔

## خیر و شر

فلسفہ کا ایک انتہائی اہم مسئلہ خیر و شر کا مسئلہ ہے جس کو نہ صرف فلسفی سلجھانے میں ناکام رہے ہیں بلکہ مسلمان متکلمین بھی اس مسئلہ کو حل نہیں کر سکے۔ بعض فلسفیوں نے اس کو اضافی قرار دیا' بعض نے خیر و شر کو تصویر کے سرخ و سیاہ دھبوں سے تشبیہ دی۔ دوسروں نے نیت و ارادہ کو خیر و شر کا معیار بتایا۔ مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی اسی نقطہ نظر کے قائل ہیں۔ انہوں نے اپنی کتاب "مسئلہ جبر و قدر" میں لکھا ہے کہ انسانی افعال بعض اضافی اور اعتباری حیثیت سے اپنے اندر دو پہلو رکھتے ہیں۔ ایک خیر کا پہلو اور دوسرا شر کا پہلو۔ مجرد فعل پر نہ خیر کا حکم لگایا جا سکتا ہے نہ شر کا' البتہ انسان کی نیت اس کو شر بھی بنا سکتی ہے اور خیر بھی۔ بعض فلسفیوں نے لذت و مسرت اور بعض نے سودمندی کے حصول کو خیر کا معیار بتایا۔ ڈیکارٹ نے ایک طرف تو خدا کو خیر مطلق کہا اور دوسری طرف یہ کہہ دیا کہ خدا نے انسان کو جو عقل دی ہے وہ زندگی کے مسائل سے عہدہ برآ ہونے کے لئے ناکافی ہے۔ اسپنوزا نے خدا کو خیر و شر سے ماورا قرار دیا۔ البتہ تاریخ کے عظیم فلسفیوں سقراط' افلاطون' ارسطو' کانٹ اور جان لاک نے بتایا کہ خیر و شر کا شعور انسانی فطرت میں ازل سے ودیعت کر دیا گیا ہے۔ ایک نور یزدانی اس کے اندر موجود ہے جو اس کی رہنمائی کرتا ہے۔ بعض مسلمان متکلمین نے کہا کہ ہم اخلاقی اصولوں کو اس لئے مانتے ہیں کہ خدا اور رسول نے اس کا حکم دیا ہے۔ مولانا اصلاحیؒ نے ان نظریات پر تنقید کرکے ان کی غلطیاں واضح کی ہیں اور ان فلسفیوں کی رائے کو تسلیم کیا ہے جو کہتے ہیں کہ خیر و شر کا شعور الہامی ہے کیونکہ یہی نظریہ قرآن مجید سے قریب ہے۔

خیر و شر کے سلسلہ میں سب سے اہم سوال یہ ہے کہ اگر خیر و شر کے الگ الگ وجود ہیں تو کیا ان کے خالق الگ الگ ہیں۔ اس اہم ترین سوال کا بیشتر فلسفیوں نے جواب نہیں دیا۔ مشرکانہ مذاہب میں خیر کا خالق الگ اور شر کا دیوتا الگ مان لیا گیا۔ جن فلسفیوں نے خیر و شر کو اضافی قرار دیا انہوں نے اس مسئلہ ہی کو ختم کر دیا۔ عیسائی متکلمین نے کہا کہ خدا خود خیر مطلق ہے اس لئے وہ شر کا خالق نہیں ہو سکتا لیکن ساتھ ہی انہوں نے یہ بھی کہا کہ دنیا میں مادہ بھی ہے۔ شیطان نے انسان کو مادہ کی طرف مائل کر دیا جس سے شر وجود میں آیا۔ یعنی شر کو وجود میں لانے کا ذریعہ شیطان ہے۔ اس طرح انہوں نے بھی ثنویت پیدا کر دی۔

مولانا نے شر کے وجود کے مسئلہ کو حل کرنے کے لئے سب سے پہلے تو یہ واضح کیا ہے کہ خیر و شر کا مسئلہ اخلاقی دائرہ تک محدود ہے اور ان معاملات سے تعلق رکھتا ہے جن کے لئے انسان خدا کے سامنے مسئول ہے۔ انہوں نے بتایا کہ خدا کا خلیفہ ہونے کی وجہ سے انسان کو اختیار و ارادہ کی جو نعمت ملی ہے اس کے غلط استعمال سے شر پیدا ہوتا ہے۔ اس نعمت کو صحیح طور پر استعمال کرکے انسانیت کے لیے فائدہ مند بنایا جاسکتا ہے اور اس کو غلط استعمال کرکے انسانیت کے لئے مختلف مسائل پیدا کئے جاسکتے ہیں۔ چونکہ اختیار و آزادی کی یہی نعمت انسان کو حیوانات سے بلند کرکے منصب خلافت پر فائز کرتی ہے اس لئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس آزادی سے پیدا ہونے والے شر کا خالق اللہ تعالیٰ ہے۔ وہ تو سراسر خیر ہے۔ یہ انسان کی بد اتفاقی ہے کہ وہ اختیار کا غلط استعمال کرکے شر کا باعث بنتا ہے۔ وہ نفع عاجل کے لالچ میں بدی کا ارتکاب کرتا ہے کیونکہ بدی کا مزہ تو اس کو نقد مل جاتا ہے اور اخلاقی اصولوں کی پاسداری کے نتائج کے لئے طویل انتظار کرنا پڑتا ہے۔

جہاں تک برائی کے پھیلانے میں شیطان کے رول کا تعلق ہے مولانا نے واضح کیا کہ خدا نے شیطان کو یہ اختیار نہیں دیا ہے کہ وہ جس انسان کو چاہے لازماً گمراہ کر دے۔ اس کا سارا اعتماد وسوسہ اندازی' پروپیگنڈے اور پر فریب وعدوں پر ہے۔

خیر و شر کی بحث میں مولانا اصلاحی" جبلت اور فطرت میں فرق کرتے ہیں۔ حیوانات تو جبلت کے ساتھ بندھے ہوئے ہیں جس سے وہ سرمو انحراف نہیں کر سکتے۔ انسان کا حال اس سے مختلف ہے۔ وہ چاہے تو زہر کو تریاق بنا لے۔ درختوں کے پتوں' جڑوں اور گھاس پھونس سے اپنا پیٹ بھر لے۔ جانور ایک دوسرے سے چھین جھپٹ کر یا دوسرے کو مار کر اپنا پیٹ بھرتے ہیں۔ انسان اس معاملہ میں اخلاقی حدود کا پابند ہے۔ وہ جائز طریقے سے اپنی ضروریات پوری کرنا چاہتا ہے۔ اسی لئے اس نے انصاف کا نظام بھی قائم کر رکھا ہے تاکہ غلط طریقوں سے اپنی حیوانی اور دوسری ضروریات پوری کرنے والوں کو سزا دی جاسکے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ انسانی فطرت اخلاقی حدود کی پابند تو ہے لیکن اس کو اختیار و ارادہ کی آزادی بھی حاصل ہے۔

## جبر و اختیار

فلسفہ کا غالباً سب سے زیادہ الجھا ہوا اور مشکل ترین مسئلہ جبر و اختیار کا مسئلہ ہے جس کا خیر و شر کے مسئلہ سے بھی گہرا تعلق ہے۔ اس سوال پر کہ کیا انسان مجبور محض ہے اور اسے ایک ڈگر پر ہانک دیا گیا ہے جس پر وہ چلنے پر مجبور ہے یا وہ بالکل آزاد ہے اور جس کا جو جی چاہے وہ کر سکتا ہے۔ اس کا کوئی ہاتھ پکڑنے والا نہیں ہے۔ بیشتر فلسفی دو گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ ایک گروہ انسان کو مجبور محض تصور کرتا ہے۔ وہ انسان میں کسی ارادہ و اختیار کی آزادی کو تسلیم نہیں کرتا۔ دوسرا گروہ انسان کی آزادی و اختیار کو تسلیم کرتا ہے۔



فلسفیوں کے جس گروہ نے جبریت کے حق میں دلائل دیئے ہیں مولانا نے انہیں تین گروہوں میں تقسیم کیا۔ پہلا گروہ ان فلسفیوں کا ہے جو انسان کو ایک بڑی مشین کے پرزہ کی حیثیت دیتے ہیں ان کا نمائندہ فلسفی فیثا غورث ہے۔ اس کی رائے میں مشین کا چکر چل رہا ہے۔ انسان اس کا پرزہ ہونے کی وجہ سے اپنا مقررہ کام کرنے پر مجبور ہے۔ چونکہ پرزہ کا ہر عمل مشین کے مجموعی عمل کے تابع ہوا کرتا ہے اس لئے کسی پرزہ کی آزادی اور اختیار کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ مولانا مودودی بھی اسی نظریہ کے قائل معلوم ہوتے ہیں۔ انہوں نے اپنی کتاب "مسئلہ جبر و قدر" میں بیان کیا ہے کہ "اس مسئلہ کو سمجھنے کے لئے انسان نے اب تک جتنی کوششیں کی ہیں وہ سب ناکام ہوئی ہیں۔ ان تمام ناکامیوں کی وجہ صرف ایک ہے یعنی ان ذرائع کا فقدان جن سے انسان اس وسیع کائنات کے نظام حکومت اور اس عظیم الشان سلطنت الٰہی کے دستور اساسی کو معلوم کر سکتے۔ ہمارے سامنے ایک زبردست کارخانہ چل رہا ہے۔ ہم خود اس کارخانے کے کل پرزوں میں سے ایک حقیر پرزہ ہیں اور اس کے دوسرے پرزوں کے ساتھ ہم بھی حرکت کر رہے ہیں۔ بس اتنا ہی ہم کو معلوم ہے"۔ مولانا اصلاحی کے مطابق ان فلسفیوں کو کائنات کے مشاہدہ میں سخت مغالطہ پیش آیا ہے۔ مشین کا ایک پرزہ دوسرے کی اور دوسرا پرزہ تیسرے کی مدد کرتا ہے۔ اس طرح پورا چکر چلتا ہے۔ لیکن کائنات کے مشاہدہ سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ کائنات کی ہر چیز انسان کی خدمت میں لگی ہوئی ہے۔ اس کے لئے سورج بھی سرگرم ہے اور چاند بھی منور ہے' زمین کی گردش بھی اسی کی ضرورت کے مطابق ہے' زمین اپنے خزانے بھی اسی کے لئے اگل رہی ہے۔ مشاہدہ سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ انسان ہی اس کائنات کا گل سرسبد ہے۔ وہ سب کا مخدوم ہے لیکن کسی کا خادم نہیں۔ لہٰذا جب تک یہ ثابت نہ کر دیا جائے کہ انسان واقعی دوسری اشیاء کی خدمت پر مجبور ہے ان فلسفیوں کی دلیل میں کوئی وزن نہیں۔

جبر کے قائل فلسفیوں کے دوسرے گروہ کا کہنا ہے کہ جس طرح دنیا طبیعیات کے بے لچک قوانین کے تحت چل رہی ہے انسان بھی ان ہی بے لچک قوانین کے تابع ہے۔ اس وجہ سے اس کے لئے آزادی اور خود مختاری کا سوال بے معنی ہے۔ اس گروہ کا نمائندہ فلسفی ہیرا قلیطس ہے۔ مولانا نے کہا کہ یہ فلسفی یہ بات اس لئے کہنے پر مجبور ہوئے ہیں کہ یہ انسان کے اندر صرف جان کے قائل ہیں اور روح کا کوئی تصور ان کے پاس نہیں ہے۔ ان کے خیال میں جس طرح جانوروں کے اندر جان پائی جاتی ہے اسی طرح انسانوں میں بھی پائی جاتی ہے۔ مولانا کا کہنا ہے کہ یہ انسان کا نہایت حقیر تصور ہے کہ وہ دوسرے جانوروں کی مانند صرف جان رکھتا ہے۔ جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اس کے اندر روح بھی موجود ہے جو فنا نہیں ہوتی بلکہ ہمیشہ موجود رہتی ہے۔ وہ طبعی قوانین کے تابع نہیں ہوتی بلکہ ایک ملکوتی نور ہے۔ وہ روٹی سے نہیں بلکہ خدا کے کلمہ سے زندہ رہتی ہے۔ انسان عقل سے مسلح اور نور یزدانی سے منور ہے اس لئے اس کے اندر نیکی و بدی کا تصور موجود ہے۔ اور جب یہ تصور موجود ہے تو اسے نیکی و بدی کی راہ پر چلنے کا اختیار بھی

ہونا چاہیے:

جبر محض کے مدعی فلسفیوں کے تیسرے گروہ کا کہنا ہے کہ ازل سے ابد تک تمام واقعات علت و معلول کی ایک طویل زنجیر کی کڑیاں ہیں۔ انسان بھی اس زنجیر کی ایک کڑی ہے۔ اس وجہ سے اس کے اعمال ایسے عوامل کا نتیجہ ہیں جن پر انسان کو کوئی کنٹرول نہیں۔ اس گروہ کا نمائندہ فلسفی زینو ہے۔ مولانا اصلاحی اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ انسان علت و معلول کی زنجیر میں بندھا ہوا ہے۔ لیکن انہوں نے یہ سوال اٹھایا ہے کہ علت اولیٰ جو تمام معلولوں کا سرچشمہ ہے کیا کسی ایسے معلول کو وجود میں لانے سے قاصر ہے جو ایک خاص دائرہ میں اپنے ارادہ سے کام کرے؟ مولانا نے اس کا جواب دیتے ہوئے کہا ہے کہ حقیقت یہ ہے کہ انسان اگرچہ ایک معلول ہے لیکن خالق نے یہ ایک ایسا معلول پیدا کیا ہے جو اپنے ارادہ سے بہت سے کام کرتا ہے اور بہت سے اعمال کی علت بنتا ہے۔ وہ اپنے دائرہ میں آزاد ہے۔ وہ اپنے نفس میں خیر و شر کا شعور بھی رکھتا ہے اور خیر کو اختیار کرنے اور شر سے بچنے اور دوسروں کو بچانے کا داعیہ بھی رکھتا ہے۔

اختیار کے قائل فلسفی یہ کہتے ہیں کہ اگر انسان کو آزادی حاصل ہے تو اس کو قدم قدم پر عقل کی رہنمائی کی ضرورت ہو گی کیونکہ وہی بتائے گی کہ نیکی کیا ہے اور بدی کیا ہے اور ارادہ کو بروئے کار لانے کے لئے کون سی تدبیر اختیار کی جائے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ فلسفی عقل کو مرشد کامل مانتے ہیں۔ جبکہ دوسرے بڑے بڑے فلسفی عقل کو مرشد کامل نہیں مانتے کیونکہ عقل جذبات اور خواہشات سے مغلوب ہو جاتی ہے۔ وہ دور تک مستقبل میں نہیں جھانک سکتی۔ وہ باطل سے باطل چیز کی حمایت میں پورا فلسفہ کھڑا کر دیتی ہے۔ مولانا نے یہ سوال اٹھایا ہے کہ اگر ایسے رہنما کے اعتماد پر انسان کے ہاتھ میں اختیار کی آزادی کی لگام پکڑا دی گئی ہے تو وہ نادان کے ہاتھ میں تلوار نہیں بلکہ پاگل کے ہاتھ میں بم ہے۔ اس لئے یہ ضروری ہے کہ انسان کی عقل میں جو خلا ہے اس کا کوئی نہ کوئی علاج بتایا جائے۔ لیکن تمام بڑے فلسفیوں نے عقل کی کوتاہیوں کی نشاندہی کرنے کے باوجود اس کو کافی سمجھا ہے۔ مولانا کا کہنا ہے کہ عقل کے اس خلا کے معنی یہ ہیں کہ انسان کسی بالاتر رہنمائی کا محتاج ہے۔ اور مذہب نے اس خلاء کا علاج وحی الٰہی بتایا ہے۔ اسی سبب سے زندگی کے مختلف گوشوں میں انسان کی رہنمائی کے لئے اللہ تعالیٰ نے نبوت کا سلسلہ شروع کیا۔ بعد میں اہل مذہب نے اس رہنمائی کو بھی مسخ کر کے رکھ دیا۔ اس لئے لازم ہو گیا کہ انسان کو ایک ایسے نبی کامل کی رہنمائی حاصل ہو جو بالکل محفوظ ہو۔ یہی رہنمائی قرآن مجید کی شکل میں محفوظ ہے۔ قرآن مجید عقل کو معتوب قرار نہیں دیتا بلکہ اس کو رہنمائی فراہم کرتا ہے۔ اس نے زندگی کے مختلف دائروں میں حدود متعین کر دیئے ہیں اور عقل کو ان کے اندر غور کرنے کی پوری آزادی دے دی ہے۔ یہ حدود یا بنیادی حقیقتیں بدیہیات میں سے ہیں جن کو ہر شخص سمجھ سکتا ہے۔ مثلاً خدا کو ماننا' عدل کا خیر ہونا' صداقت کا حسن ہونا'



رحم کا ایک اعلیٰ صفت ہونا' ظلم و زیادتی اور حق تلفی کا گناہ ہونا وغیرہ۔ اگر انسان خدا کی بنائی ہوئی حدود کے اندر عقل استعمال نہیں کریں گے تو پھر ان کے گمراہ ہونے کا اندیشہ ہے۔ اس لئے وحی الٰہی نے ان دونوں خطروں سے انسان کو محفوظ کر دیا ہے تاکہ انسان اپنی فطرت کے مطابق زندگی بسر کر سکے۔

عیسائی متکلمین کا کہنا ہے کہ جب خدا نے انسان کو پیدا کیا تو اول اول اس کو ارادہ اور اختیار کی آزادی بخشی لیکن آدم نے گناہ کا راستہ اختیار کیا جس کی پاداش میں نہ صرف آدم بلکہ ان کی تمام ذریت اس نعمت سے محروم کر دی گئی۔ اس لئے اب تمام انسان شر کے غلام اور گناہ کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہیں۔ البتہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے بعض انسانوں کو نجات کے لئے منتخب کر لیتا ہے اور دوسروں کو ان کے گناہ کی پاداش میں عذاب میں ڈال دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا انتخاب سراسر اس کی مرضی پر منحصر ہے۔ انسان کے اعمال اس پر اثرانداز نہیں ہو سکتے۔

مولانا نے اس عقیدہ پر تنقید کرتے ہوئے کہا کہ اگر اس بات کو عقلی اصولوں پر پرکھا جائے تو عیسائی متکلمین کا اللہ تعالیٰ کے متعلق تصور بالکل عامیانہ اور طفلانہ نظر آتا ہے۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ دنیا کے عام بادشاہوں اور حکمرانوں کی طرح اللہ تعالیٰ بھی تجربات کے مراحل سے گزر رہا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سوچے سمجھے بغیر اختیار کی تلوار آدم کے ہاتھ میں پکڑا دی ہے اور اسے شروع میں یہ اندازہ نہیں ہوا کہ آدم کیا کر بیٹھے گا۔ لیکن جب آدم نے غلطی کی تو گھبرا کر صرف آدم ہی سے نہیں بلکہ تمام ذریت آدم سے اختیار چھین لیا گیا۔ مولانا کا کہنا ہے کہ یہ تصور عقل و فطرت کے خلاف ہے کیونکہ اگر خدا کو بھی تجربات کے مرحلہ سے گزرنا پڑے تو پھر وہ خدا کیا ہوا؟ خدا کے علم کے لئے ضروری ہے کہ یہ محیط کل ہو۔ وہ دنیا کے وجود میں آنے سے لے کر خاتمہ تک اس کی ہر چیز کو جانتا ہو۔ جہاں تک انسان کے اپنے اختیار کے غلط استعمال کرنے کا سوال ہے تو چونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کی رہنمائی کے لئے رشد و ہدایت کا سامان کر دیا' انبیاء اور مصلحین بھیجے تو پھر اس کا احتساب بھی ہو گا۔ اس لئے یہ بات انصاف کے خلاف ہوتی کہ محض اس اندیشہ کی بناء پر کہ آدم کی ذریت میں گمراہی پھیلانے والے بھی پیدا ہوں گے پوری انسانیت کو خدا کی خلافت کا حق ادا کر کے ابدی بادشاہی کا مقام حاصل کرنے کے موقع سے محروم کر دیا جاتا۔

عیسائی متکلمین کی اس بات کو بھی مولانا نے قرآن کی روشنی میں رد کر دیا ہے کہ حضرت آدم کا گناہ اس کی ذریت کے ساتھ چپک گیا ہے جس سے اب چھٹکارا ممکن نہیں۔ مولانا نے کہا کہ ان عیسائی متکلمین کو آدم کے گناہ کی خبر تو ہے لیکن ان کی توبہ کی خبر نہیں جس کا قرآن مجید نے بڑے شاندار طریقہ سے ذکر کیا اور بتایا کہ اس کے کلمات بھی اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کو بتائے تھے۔ اس توبہ کے بعد اللہ تعالیٰ نے آدم کا گناہ معاف کر دیا۔ لہٰذا آدم کو زمین میں لعنت کے طور پر نہیں بھیجا گیا۔ توریت میں اگرچہ حضرت آدم کی توبہ کا ذکر نہیں ہے لیکن ہابیل اور قابیل کا قصہ تو موجود ہے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ جس آدم کی

صلب سے بائبل جیسا فرزند پیدا ہوتا ہے جو اپنے کردار اور تقویٰ کے اعتبار سے اعلیٰ درجہ کا آدمی اور دین کے بنیادی حقائق سے واقف ہے تو آدم خود اتنا غبی کیسے ہو سکتا ہے کہ یہ بھی نہ جان سکے کہ وہ اپنی غلطی کی وجہ سے عتاب میں آ جائے گا' اور جب عتاب میں آ جائے تو اس کے وبال سے نکلنے کے لئے اپنی غلطی پر ندامت کا اظہار کر کے توبہ بھی نہ کرے۔ سیدنا مسیحؑ نے توبہ کی عالی مقامی کا نہایت شاندار الفاظ میں ذکر کیا ہے۔ وہ تو یہ کہتے ہیں کہ توبہ کرنے کے بعد انسان کا مقام پہلے سے بھی بلند ہو جاتا ہے۔

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ باپ کے گناہ کی ذمہ داری قیامت تک اس کی اولاد پر ہو گی تو یہ بات بالکل خلاف عقل ہے اس لئے کہ اولاد پر ان گناہوں کی ذمہ داری ہونی چاہیے جن میں وہ اپنے باپ کی پیروی کریں۔ اگر اولاد نہ صرف یہ کہ ان گناہوں کی پیروی نہ کرے بلکہ اس موقع پر موجود بھی نہ ہو جہاں گناہ ہوا ہو تو پھر اس کی ذمہ داری اولاد پر نہیں ہو سکتی۔

مسلمان متکلمین میں ماتریدیہ' اشاعرہ اور معتزلہ بالکل متضاد رائے رکھتے ہیں۔ معتزلہ کا مذہب یہ ہے کہ انسان خود مختار مطلق ہے۔ مولانا کا کہنا ہے کہ اگر مختار مطلق سے مراد یہ ہے کہ اس اختیار پر خدا کی مشیت کسی پہلو سے اثر انداز نہیں ہوتی تو یہ کسی طرح درست نہیں ہے۔ اس سے ثنویت لازم آتی ہے۔ کیونکہ مطلق ارادہ تو صرف اللہ تعالیٰ ہی کا ہو سکتا ہے' کوئی دوسرا ارادہ ایسا نہیں ہو سکتا جو خدا کی مشیت کے تابع نہ ہو۔ مولانا کے نزدیک انسان کو جو اختیار حاصل ہے وہ یہ ہے کہ وہ ایک چیز کا انتخاب کر کے اس کے لئے جدوجہد کر سکتا ہے لیکن اس کا نتیجہ اس کے اختیار میں نہیں ہے۔

اشاعرہ کا مذہب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لئے بالکل جائز ہے کہ انسان پر اس چیز کی ذمہ داری ڈال دے جو اس کی طاقت سے باہر ہو۔ اس کے لئے یہ بھی ضروری نہیں کہ بندوں کی مصلحت کے مطابق کام کرے' بلکہ وہ جو جی چاہے کرے۔ مولانا اصلاحیؒ کا کہنا ہے کہ اشاعرہ کو جو غلط فہمی ہوئی ہے۔ وہ لفظ جبر کے ساتھ لفظ قدر سے ہوئی ہے۔ قدر کے معنی یہ ہیں کہ جو چیز پیش آنے والی ہے وہ خدا نے پہلے سے لکھی ہوئی ہے۔ مولانا نے کہا کہ اگر خدا یہ جانتا ہے کہ فلاں شخص دوزخ میں جائے گا تو خدا یہ بھی جانتا ہے کہ یہ شخص اپنے ارادہ کی آزادی کے ساتھ فلاں فلاں جرائم کرے گا جس کے نتیجہ میں جہنم میں جائے گا۔ اسی طرح یہ بھی ممکن ہے کہ خدا کسی شخص کے متعلق یہ جانے کہ وہ نیکی کا فلاں فلاں کام کرے گا جس کی وجہ سے وہ جنت میں جائے گا۔ ایسا ماننے سے خدا کے علم کی نفی نہیں ہوتی۔ اس لئے اصل غلطی یہ ہے کہ اشاعرہ نے اصل موثر خدا کے علم کو مانا ہے حالانکہ اصل موثر انسان کے اپنے اعمال ہیں۔ اس کا ذکر قرآن مجید میں بڑے واضح طور پر ان مقامات پر ہوا ہے جن میں بتایا گیا ہے کہ جو شخص نیکی کا راستہ اختیار کرے گا وہ جنت میں جائے گا اور جو برائی کا راستہ اختیار کرے گا وہ دوزخ میں جائے گا۔ یعنی جنت و دوزخ کو انسان کے اچھے یا برے اعمال کے ساتھ مشروط کیا گیا ہے۔

بقیہ صفحہ 95 پر



امین احسن اصلاحی

# تذکرہ و تبصرہ

یہ اداریہ نوٹ جنوری 1964 کے ماہنامہ میثاق کے لیے لکھا گیا تھا۔ اس وقت جماعت اسلامی خلاف قانون قرار دے دی گئی تھی۔ مولانا اصلاحی نے حکومت کے اس فیصلہ کو غیر حکیمانہ قرار دیا۔ ان دنوں مارشل لاء کے تحت اخبارات و رسائل پر سنسرشپ عائد تھی' لہٰذا یہ اداریہ چھپ نہ سکا۔ اسے اب شائع کیا جا رہا ہے کیونکہ اس سے بھی مولانا کی شخصیت کے ایک پہلو کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔ (مدیر)

اس واقعہ سے قدرتی طور پر ہمیں بڑا صدمہ ہوا ہے کہ جماعت اسلامی خلاف قانون قرار دے دی گئی اور اس کے پچاس سے زائد ارکان اور مولانا مودودیؒ گرفتار کر لیے گئے ہیں۔ ایک عرصہ سے جماعت اور حکومت کی کشمکش جس انداز سے ترقی کر رہی تھی اس کا آخری متوقع نتیجہ یہی تھا جو بالآخر ظاہر ہو کر رہا۔ اس امر میں جماعت کے حضرات سے اب ہمیں کچھ کہنا نہیں ہے۔ ہمارے اوپر ان حضرات کے لیے جو حق نصیحت عائد ہوتا تھا ہم پوری تفصیل کے ساتھ قولاً و عملاً' سراً و علانیۃً اور تحریراً و تقریراً ادا کر چکے ہیں اور ان حضرات کی طرف سے اس کی پوری پوری سزا بھی بھگت چکے ہیں۔ البتہ حکومت کی خدمت میں اس موقع پر چند معروضات ہم پیش کرنا چاہتے ہیں اور یہ بھی اس حق خیر خواہی کے تحت ہے جو پاکستان کے ایک شہری کی حیثیت سے اپنی حکومت سے متعلق ہم پر عائد ہوتا ہے۔ اور ہم امید کرتے ہیں کہ ہمارے محترم صدر ریاست اور ان کے رفقاء ہماری ان معروضات پر توجہ فرمائیں گے۔

پہلی گزارش تو ہم یہ کریں گے کہ اس وقت جماعت کے خلاف کسی اقدام کی' اور وہ بھی ایسے سخت اقدام کی' بظاہر حالات کوئی خاص ضرورت نہیں تھی۔ جہاں تک صدر ایوب کی حکومت کا تعلق ہے وہ کافی مستحکم ہے اور اس کے استحکام میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ ایک ایسی مستحکم حکومت کو اپنی حریف پارٹیوں کے معاملہ میں نہایت روادار اور فیاض ہونا چاہیے' اگرچہ ان کا رویہ کچھ غلط بھی ہو۔ جہاں تک جماعت کا تعلق ہے اس کا حال ایک عرصہ سے یہ ہے کہ لوگوں کے اندر اس سے جو حسن ظن پیدا ہوا تھا وہ آہستہ آہستہ ختم ہو رہا ہے۔ اس کے بہت سے ذی علم و ذی صلاحیت ارکان اس سے الگ ہو گئے۔ مذہبی طبقہ اس سے سخت بدگمان بلکہ بیزار ہے۔ عوام میں اس کا کچھ زیادہ اثر نہ پہلے تھا نہ اب ہے۔ اس کی تنظیم کا ظاہری ڈھانچہ اگرچہ کھڑا تھا لیکن اس کے اندرونی نظام میں بددلی' مایوسی اور بے اعتمادی سرایت کر چکی تھی۔ جماعت نے اپنی ساکھ بحال کرنے کے لیے اب مذہب کو چھوڑ کر سیاست کے میدان میں ہاتھ پاؤں مارنے شروع کیے تھے لیکن ہر شخص جانتا ہے کہ اس میدان میں اس کا ہر قدم الٹا ہی پڑا۔ ایسے حالات میں جماعت

کے خلاف اس سخت اقدام کا فائدہ بظاہر تو اس کے سوا کوئی اور نظر نہیں آتا کہ لوگوں کے اندر جماعت کے ساتھ اسی قسم کی ہمدردی پیدا ہو جو ایک مظلوم کے ساتھ ہوا کرتی ہے۔

دوسری گزارش یہ ہے کہ جماعت اور مولانا مودودی کے خلاف حکومت کے بعض الزامات صریحاً غلط ہیں۔ ان کو بار بار دہرانا نہیں چاہیے۔

مولانا مودودی صاحب پاکستان کے کبھی مخالف نہیں تھے۔ تقسیم ملک سے پہلے وہ نیشنلسٹ مسلمانوں کے مقابل میں قائداعظم کے اور کانگریس کے مقابل میں مسلم لیگ کے پرزور حامی تھے۔ انہوں نے ترجمان القرآن میں قائداعظم کو "کونوا عباد الله اخوانا" کا داعی لکھا تھا اور مسلم لیگ کے نقطہ نظر کی نہایت پرزور حمایت کی تھی۔ البتہ ان کا یہ خیال ضرور تھا کہ مسلم لیگ کی قیادت ملک کو تقسیم تو کرا سکتی ہے لیکن تقسیم کے بعد پاکستان میں اسلامی حکومت نہیں قائم کر سکتی۔ اسی خیال کے تحت انہوں نے مسلم لیگ سے الگ جماعت اسلامی کے قیام کو بھی ضروری سمجھا اور اسی نقطہ نظر سے انہوں نے مسلم لیگ کی قیادت پر تنقیدیں بھی کیں۔ ان تنقیدوں کا لب و لہجہ سخت و شدید ضرور تھا لیکن ان سے مقصود ہندوؤں کو تقویت پہنچانا نہیں بلکہ لیگ کے اندر اور لیگ سے باہر ایک اسلامی محاذ بنانا تھا۔

کشمیر کے معاملہ میں مولانا مودودی سے چوک ضرور ہوئی لیکن یہ چوک محض ایک چوک تھی۔ اس میں ان کی کسی بدنیتی کو دخل نہیں تھا۔ وہ بھارت اور پاکستان کے باہمی معاہدہ صلح کا یہ لازمی تقاضا سمجھتے تھے کہ جب تک یہ معاہدۂ صلح قائم ہے اس وقت تک پاکستان کے عام افراد کشمیر کے معاملہ میں کوئی حصہ نہیں لے سکتے۔ اپنے اس خیال کے تحت انہوں نے ایک رائے ظاہر کی لیکن جماعت کی اس وقت کی مجلس شوریٰ نے ان کی اس رائے سے اتفاق نہیں کیا' بلکہ اس نے یہ رائے دی کہ اس قسم کے معاہدات اپنے بین الاقوامی مفہوم ہی میں لیے جائیں گے۔ یہی صحیح شرعی موقف ہے۔ شوریٰ کی یہ رائے مولانا مودودی کی رائے سے اظہار بے تعلقی کے ہم معنی تھی۔ لیکن اس وقت اس قسم کی بے تعلقی کے اعلان کے بجائے سر ظفر اللہ کے' جو اس وقت وزیر خارجہ تھے' ایک اعلان سے فائدہ اٹھا کر یہ مناسب سمجھا گیا کہ مولانا مودودی اس اعلان کی روشنی میں اپنے موقف میں تبدیلی کر لیں۔ چنانچہ انہوں نے ایسا کر لیا اور اس کے بعد سے وہ اور ان کی جماعت برابر کشمیر کے لیے زبان سے اسی طرح جہاد کے لیے اعلان کر رہے ہیں جس طرح دوسرے لوگ کر رہے ہیں۔ پھر جس غلطی کی نوعیت ایک علمی غلطی کی تھی اور جس کی سزا مولانا اور ان کے ساتھ ان کے بعض بے قصور رفقاء بھی 20 ماہ کی نظربندی کی صورت میں بھگت چکے ہیں' اب اس کو ایک الزام کی شکل میں بار بار کیوں دہرایا جا رہا ہے۔ میں یہ بات بھی پورے اعتماد کے ساتھ ظاہر کرنا چاہتا ہوں کہ اپنی مذکورہ رائے کے اظہار سے مولانا کا مقصد پاکستانی مجاہدین کی حوصلہ شکنی نہیں تھا بلکہ پاکستان کی حکومت کو اس بات پر اکسانا تھا کہ وہ معاہدے کی ذمہ داریوں سے براءت کا اعلان کر دے۔ ہمارے نزدیک



مولانا کی یہ رائے ٹھیک نہیں تھی لیکن اس میں' جیسا کہ میں نے عرض کیا' کسی بدنیتی کو دخل نہیں تھا۔

طلبہ کے ہنگاموں میں اگر حکومت جماعت کو ملوث سمجھتی ہے تب بھی جماعت کے خلاف کم از کم اس قسم کے کسی اقدام کی ضرورت نہیں تھی۔ اول تو حکومت نے اپنے حسن تدبیر سے حالات کو بالکل قابو میں کر لیا اور اس سلسلے میں اس کے فیاضانہ رویے سے ہر شخص نے اچھا تاثر لیا۔ ثانیاً' جماعت اس سلسلہ میں کافی بدنام ہو چکی تھی۔ ہمارا تو اندازہ یہ ہے کہ اس کے حصے میں جو بدنامی آئی وہ شائد وزن میں اس کے جرم کی مقدار سے زائد ہی رہی۔ پھر کیا یہ بہتر نہ ہوتا کہ جماعت کو اس بات کا موقع دیا جاتا کہ وہ از خود اپنے رویے پر نظرثانی کرتی۔ اس طرح شائد اصلاح حال کے پہلو سے اس سے بہتر نتائج پیدا ہوتے جو اس اقدام سے پیدا ہو سکتے ہیں۔

حکومت کا سب سے سنگین الزام جماعت پر مخالف پاکستان حکومتوں سے مالی امداد حاصل کرنے کا ہے۔ حکومت نے یہ الزام جماعت پر اتنے جزم کے ساتھ لگایا ہے کہ اس کو پڑھ کر ہمارا تو دل کانپ گیا ہے۔ اس الزام کے بعد ہم حکومت کو اس امر کا حقدار سمجھتے ہیں کہ وہ جماعت کو جو سزا چاہے دے لیکن ساتھ ہی ہم جماعت کو بھی اس بات کا حقدار سمجھتے ہیں کہ اس الزام کی باقاعدہ عدالتی تحقیقات ہونی چاہیے۔ اگر اس کی تحقیقات نہ ہوئی تو ہم اسلامی تعلیمات کی روشنی میں اس کو مجرد ایک الزام سمجھیں گے اور جماعت کو مظلوم۔ ہمیں حکومت کے بعض ذمہ داروں کے اس اعلان سے اطمینان ہوا ہے کہ حکومت بھی اس معاملہ کو عدالت میں لانا چاہتی ہے۔ حکومت اس کام میں جتنی ہی جلدی کرے گی انصاف اور مصلحت دونوں اعتبارات سے یہ بات بہتر ہو گی۔

ہماری ان گزارشات سے مقصود صرف یہ ہے کہ حکومت کو اس معاملے میں وہ عادلانہ اور حکیمانہ روش اختیار کرنی چاہیے کہ نہ ملک کی اپوزیشن پارٹیوں کو یہ کہنے کا موقع ملے کہ حکومت ان کو دبانا چاہتی ہے اور نہ بیرون ملک کے لوگوں پر یہ اثر پڑنے پائے کہ صدر ایوب کی حکومت کسی مشکل سے دوچار ہے کہ اسے جماعتوں کو خلاف قانون قرار دینے کے حربے کو استعمال کرنا پڑ رہا ہے۔ اور پھر سب سے زیادہ ہمیں جس بات کا احساس ہے وہ یہ ہے کہ مالی امداد والا الزام ہماری پوری قوم اور پورے ملک کے لیے موجب رسوائی ہے۔ چونکہ یہ الزام ایک مذہبی جماعت پر لگایا گیا ہے اس وجہ سے اس میں دین اور اہل دین کی خاص طور پر رسوائی ہے۔ اس وجہ سے اس الزام کی تحقیقات کا انتظام حکومت کو فوراً کرنا چاہیے۔

امین احسن اصلاحی

# مولانا اختر احسن اصلاحی مرحوم

میں اور مولانا اختر احسن اصلاحی مرحوم دونوں ایک ہی ساتھ ۱۹۱۴ء میں مدرسۃ الاصلاح (سرائے میر' اعظم گڑھ) کے ابتدائی درجوں میں داخل ہوئے اور مدرسہ کا آٹھ سال کا تعلیمی کورس پورا کرکے ایک ہی ساتھ ۱۹۲۲ء میں فارغ ہوئے۔ اس کے بعد مولانا اختر احسن تو مدرسہ ہی میں تدریس کی خدمت پر مامور ہو گئے اور میں دو ڈھائی سال اخبارات میں اخبار نویسی کرتا پھرا۔ ۱۹۲۵ء میں استاذ امام مولانا فراہی ؒ نے مجھے یہ ایماء فرمایا کہ میں اخبار نویسی کا لاطائل مشغلہ چھوڑ کر ان سے قرآن پڑھوں۔ میرے لیے اس سے بڑا شرف اور کیا ہو سکتا تھا۔ میں فوراً تیار ہو گیا اور مولانا ؒ نے مدرسہ ہی میں درس قرآن کا آغاز فرما دیا جس میں مدرسہ کے دوسرے اساتذہ کے ساتھ مولانا اختر احسن مرحوم بھی شریک ہوتے رہے۔ یہ سلسلہ پورے پانچ سال قائم رہا۔

طالب علمی کے دور میں تو ہم دونوں کے درمیان ایک قسم کی معاصرانہ چشمک و رقابت رہی' تعلیم کے میدان میں بھی اور کھیل کے میدان میں بھی' لیکن مولانا فراہی ؒ کے درس میں شریک ہونے کے بعد ہم میں ایسی محبت پیدا ہو گئی کہ اگر میں یہ کہوں تو ذرا بھی مبالغہ نہ ہو گا کہ ہماری یہ محبت دو حقیقی بھائیوں کی محبت تھی۔ وہ عمر میں مجھ سے غالباً سال ڈیڑھ سال بڑے رہے ہوں گے۔ انہوں نے اس بڑائی کا حق یوں ادا کیا کہ جن علمی خامیوں کو دور کرنے میں مجھے ان کی مدد کی ضرورت ہوئی اس میں انہوں نے نہایت فیاضی سے میری مدد کی۔ بعض فنی چیزوں میں ان کو مجھ پر نہایت نمایاں تفوق حاصل تھا۔ اس طرح کی چیزوں میں ان کی مدد سے میں نے فائدہ اٹھایا۔ اس پہلو سے اگر میں ان کو اپنا ساتھی ہی نہیں بلکہ استاذ بھی کہوں تو شائد بے جا نہ ہو۔

مولانا فراہی ؒ کے درس میں اگرچہ مدرسہ کے دوسرے اساتذہ بھی شریک ہوتے لیکن میرے واحد ساتھی مولانا اختر احسن ہی تھے۔ مولانا رحمتہ اللہ علیہ کی خاص توجہ بھی ہم ہی دونوں پر رہی۔ مولانا اختر احسن اگرچہ بہت کم سخن آدمی تھے لیکن ذہین اور نہایت نیک مزاج۔ اس وجہ سے ان کو برابر مولانا ؒ کا خاص قرب اور اعتماد حاصل رہا۔ انہوں نے حضرت استاذ ؒ کے علم کی طرح ان کے عمل کو بھی اپنانے کی کوشش کی جس کی جھلک ان کی زندگی کے ہر پہلو میں نمایاں ہوئی اور مجھے ان کی اس خصوصیت پر برابر رشک رہا۔ مولانا اختر احسن کو استاذ امام ؒ کی خدمت کا بھی شرف حاصل ہوا حالانکہ مولانا ؒ کسی کو خدمت کا موقع مشکل ہی سے دیتے تھے۔ یہ شرف ان کو ان کی طبیعت کی اپنی خوبیوں کی وجہ سے حاصل ہوا جن کی طرف میں نے اوپر اشارہ کیا۔



استاذ امام رحمتہ اللہ علیہ مدرسۃ الاصلاح کے ذریعہ سے جو تعلیمی اور فکری انقلاب پیدا کرنا چاہتے تھے اس میں سب سے بڑی رکاوٹ موزوں اشخاص نہ ملنے کے سبب سے تھی۔ مولانا اختر احسن مولانا رحمتہ اللہ علیہ کی تربیت سے اس مقصد کے لیے بہترین آدمی بن گئے تھے۔ اگر ان کو کام کرنے کی فرصت ملی ہوتی تو توقع تھی کہ ان کی تربیت سے مدرسۃ الاصلاح میں نہایت عمدہ صلاحیتوں کے اتنے اشخاص پیدا ہو جاتے جو نہایت وسیع دائرے میں کام کر سکتے لیکن ان کو عمر بہت کم ملی' اور جو ملی اس میں بھی وہ برابر مختلف امراض کا ہدف رہے۔ تاہم اللہ تعالیٰ نے ان کو بڑا حوصلہ عطا فرمایا تھا۔ اپنی مختصر زندگی میں انہوں نے مدرسۃ الاصلاح کی بڑی خدمت کی اور خاص بات یہ ہے کہ اپنی اس خدمت کا معاوضہ انہوں نے اتنا کم لیا کہ اس ایثار کی کوئی دوسری مثال مشکل ہی سے مل سکے گی۔

میں نے ۱۹۳۵ء میں استاذ امام رحمتہ اللہ کی غیر مطبوعہ تصنیفات کی ترتیب و تہذیب اور اشاعت کے لیے مدرسۃ الاصلاح میں دائرہ حمیدیہ کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا۔ اس کے زیر اہتمام ایک اردو ماہنامہ بھی 'الاصلاح' کے نام سے جاری کیا تاکہ مولانا رحمتہ اللہ علیہ کے افکار سے اردو خواں طبقہ کو بھی آشنا کیا جائے۔ اس ادارے میں مولانا ؒ کے عربی مسودات کی ترتیب و تہذیب کا کام مولانا اختر احسن مرحوم نے اپنے ذمہ لیا اور رسالہ کی ترتیب کی ذمہ داری میں نے اٹھائی۔ مولانا اختر احسن اگرچہ تحریر و تقریر کے میدان کے آدمی نہیں تھے لیکن مولانا رحمتہ اللہ علیہ کی تصنیفات کے ترجمہ کے کام میں انہوں نے میری بڑی مدد فرمائی اور رسالہ میں بھی ان کے مضامین وقتاً فوقتاً نکلتے رہے۔ رسالہ تو کچھ عرصہ کے بعد بند ہو گیا لیکن دائرہ حمیدیہ الحمد للہ برابر استاذ امام ؒ کی عربی تصنیفات کی اشاعت کا کام کر رہا ہے اور اس کے کرتا دھرتا مولانا اختر احسن مرحوم کے تلامذہ ہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی سعی مشکور فرمائے۔

مولانا اختر احسن مرحوم پر یہ چند سطریں میں نے مولانا کے ایک شاگرد کے اصرار پر لکھ دی ہیں۔ اگر مجھے استاذ مرحوم کی سیرت لکھنے کی سعادت حاصل ہوتی تو اس بسلسلہ تلامذۂ فراہی ان کا ذکر تفصیل سے آتا لیکن اب بظاہر اس طرح کے کسی کام کا موقع میسر آنے کی توقع باقی نہیں رہی۔ اب تو بس یہ آرزو ہے کہ اللہ تعالیٰ آخرت میں استاذ مرحوم کے ساتھ برادر مرحوم کی معیت بھی نصیب کرے۔

ڈاکٹر منصور الحمید

# سقراط اور مولانا اصلاحیؒ

۱۹۹۶ء کی گرمیوں میں دمام (سعودی عرب) سے پاکستان گیا تو میں نے اپنی کتاب "سقراط" مولانا اصلاحیؒ کی خدمت میں پیش کی۔ مولانا ان دنوں اپنی بیماری کے باعث پڑھنے سے تقریباً معذور تھے اور بمشکل چند صفحات الٹ پلٹ لیتے تھے لیکن سقراط کی شخصیت سے دلچسپی کی بناء پر انہوں نے میری کتاب کے پچاس ساٹھ صفحات تک پڑھ ڈالے۔ اس موقع پر میں برابر ان کی خدمت میں حاضر ہوتا رہا۔ تین چار نشستوں میں مولاناؒ کی گفتگو کا موضوع سقراط ہی رہا۔ میں نے یہ گفتگو اس وقت ریکارڈ کر لی اور اسے مرتب کرکے مضمون کی صورت میں ارسال کر رہا ہوں۔ یہ حتی الامکان مولانا مرحوم کے الفاظ ہی میں ہے:

"مجھے جس طرح قرآن مجید سے دلچسپی ہے' ایک زمانے میں اسی طرح سقراط سے بھی دلچسپی رہی ہے۔ گو میں نے دیگر فلاسفہ کو بھی پڑھا ہے لیکن سقراط کو نہایت غور سے اور حرف بحرف پڑھا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی باتیں عقل و فطرت کے مطابق ہیں۔ وہ انسانی ذہن کے تقاضوں کے مطابق بات کرتا ہے۔ قدیم یونانی حکماء میں سے ارسطو نہایت پڑھا لکھا آدمی ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ براہ راست انسانی فطرت سے اسے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مجھے ارسطو میں اپنے ذوق کی غذا نہیں ملی جبکہ سقراط کی باتیں مجھے فطرت کے قریب محسوس ہوتی ہیں۔ شاید اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ کہتے ہیں کہ وہ مصنوعی طور پر پڑھا لکھا نہیں تھا۔

میری دلچسپی کی ایک بڑی وجہ یہ بھی تھی کہ وہ ان الجھنوں کو جو میرے ذہن میں ہوتی تھیں' ایک نہایت حکیمانہ سوال کی شکل میں سامنے لے آتا تھا۔ اگرچہ اس کے جو جوابات نقل ہوئے ہیں مجھے اس میں کیاں محسوس ہوتی ہیں لیکن مجھے اس کے جوابات سے کم اور اس کے سوالات سے زیادہ دلچسپی رہی ہے۔ پھر وہ جس طرح جرح کرکے انسانی ذہن کو اضطراب میں ڈال دیتا ہے' یہاں تک کہ انسان غور کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے' یہ بات قرآن مجید کے عین مطابق ہے۔ قرآن مجید بھی انسان کی غور و فکر کی صلاحیتوں ہی کو بیدار کرنا چاہتا ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ سقراط کو پڑھنا' میرے لیے قرآن مجید سمجھنے میں بھی ممد معاون ثابت ہوا ہے۔

فلسفہ کی تاریخ میں بیشتر فلاسفہ ناقل ہیں۔ جو کچھ پہلے کہا گیا اسی کو تھوڑا سا بدل کر ذرا مختلف انداز میں بیان کر دیتے ہیں۔ سقراط میں یہ خوبی ہے کہ وہ خلاق بھی ہے اور موجد بھی۔ دوسری بات یہ ہے کہ اکثر





ڈاکٹر منصور الحمید

# جماعت اسلامی سے وصل و فصل کے اسباب

(میں نے یہ انٹرویو مولانا سے دس بارہ سال پہلے لیا تھا۔ اب تک یہ کہیں شائع نہیں ہوا۔ اس میں مولانا نے جماعت اسلامی میں اپنی شمولیت اور سترہ سال بعد اس سے مستعفی ہونے پر مفصل روشنی ڈالی ہے۔ منصور الحمید)

سوال: آپ کے استاد مولانا حمید الدین فراہیؒ نے اپنی ساری زندگی عملی سیاست میں کبھی کوئی حصہ نہیں لیا جب کہ آپ نے ان سے ایک مختلف راہ اختیار کی اور ایک زمانے میں سترہ سال تک جماعت اسلامی سے منسلک رہے۔ براہ کرم یہ بتایئے کہ جماعت اسلامی میں آپ کے شامل ہونے کی وجہ کیا تھی؟

جواب: یہ حقیقت ہے کہ مولانا فراہی نے اپنی زندگی میں عملی سیاست میں کبھی کوئی حصہ نہیں لیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے نزدیک کرنے کا اصل کام یہ تھا کہ مسلمانوں کی فکری اصلاح کی جائے۔ وہ سمجھتے تھے کہ جب تک مسلمانوں کی دینی فکر صحیح نہیں ہوگی' ان کی سیاست ہی نہیں' ان کی زندگی کا ہر پہلو غلط راستے پر چل نکلے گا۔ لہٰذا سب سے ضروری اور اہم کام یہ ہے کہ مسلمانوں کی دینی فکر کو درست کرنے کی کوشش کی جائے۔ ظاہر ہے کہ یہ کوئی معمولی کام نہیں' بڑا دشوار اور عظیم کام ہے۔ مولانا فراہی نے اس کام کا بیڑا اٹھایا اور پھر زندگی بھر اس کے سوا کسی چیز کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ اپنے دور کے سیاسی ہنگاموں کے بارے میں ان کی آراء سے میرے دل پر یہ اثر پڑتا تھا کہ وہ اس کو بچوں کا کھیل سمجھتے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ تحریک خلافت کے زمانے میں' مولانا محمد علی جوہر نے ایک مجلس میں' جس میں اور لوگوں کے علاوہ مولانا سید سلیمان ندوی صاحب اور میں بھی موجود تھا' پوچھا کہ مولانا خلافت کے حق میں آپ اپنی دلیل بتایئے تو مولانا نے جواب دیا' آپ لوگ تو دلیلیں بیان ہی کرتے ہیں۔ اس جواب سے میرے دل پر یہ اثر پڑا کہ مولانا ان باتوں کو زیادہ اہمیت دینے کے لیے تیار نہیں۔ اسی طرح ترک موالات کے بارے میں ایک دفعہ سید سلیمان ندوی صاحب نے پوچھا کہ مولانا ترک موالات کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے تو انہوں نے جواب دیا' میں تو روزانہ نماز میں ترک موالات کرتا ہوں **نخلع و نترک من یفجرک**' غرض انہوں نے سیاسی کاموں میں سے نہ کسی کو کوئی وقعت دی اور نہ ہی کسی میں کوئی حصہ لیا۔ مسلمانوں کی فکری اصلاح کے پیش نظر انہوں نے عربی میں لکھنا شروع کیا۔ ان سے پوچھا گیا کہ مولانا آپ عربی میں کیوں لکھتے ہیں تو کہنے لگے۔ مسلمان/قوم کی اصلاح علماء کی اصلاح سے ہوگی اور علمائے عالم اسلام کی مشترک زبان عربی ہے۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ علماء کی اصلاح ہو' تب جا کر مسلمان قوم کی اصلاح ہو سکے گی۔

مولانا فراہی کا یہ موقف مجھ پر واضح تھا اور میں بھی اسی نہج پر کام کرنا چاہتا تھا۔ لیکن جب جماعت اسلامی قائم ہوئی تو واقعہ یہ ہے کہ میں ایک حادثے کے طور پر اس میں شامل ہو گیا۔ یہ راز بہرحال مولانا مودودی مرحوم جانتے تھے اور اب بھی بعض چوٹی کے لوگ اس سے آگاہ ہیں۔ اس حادثے کی تفصیل یہ ہے کہ مولانا مودودی صاحب مرحوم ان دنوں بہتی گنگا میں نہا رہے تھے۔ یعنی وہ متحدہ قومیت کے خلاف' جسے مسلم لیگ نے ایک ایسی تحریک بنا دیا تھا کہ اس کی مخالفت کا کوئی امکان ہی نہیں تھا' کانگرسی علماء پر سخت تنقید کر رہے تھے۔ چونکہ مودودی صاحب کے قلم میں زور بھی تھا اس لیے جب انہوں نے اس مسئلہ کو زیادہ وضاحت کے ساتھ لکھا تو مجاہد و غازی بن گئے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ مسلم لیگ کے بارے میں یہ بھی لکھتے تھے کہ وہ **کونوا عباد الله اخوانا** کی داعی ہے۔ میں اس زمانے میں اپنا رسالہ "الاصلاح" نکالتا تھا۔ میں نے اس پر ایک مضمون لکھا کہ جہاں تک متحدہ قومیت کے غلط ہونے کا تعلق ہے اس کے غلط ہونے میں کسی کو شبہ نہیں' لیکن یہ بات میں تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں کہ مسلم لیگ "**کونوا عباد الله اخوانا**" کی داعی ہے۔ مسلم لیگ کی دعوت یہ نہیں بلکہ یہ ہے کہ "مسلم ہے تو مسلم لیگ میں آ"۔ میں نے مولانا مودودی صاحب کو اس پر غور کرنے کی دعوت دی اور یہ لکھا کہ اگر دعوت دینی ہے تو اسلام کی دعوت دیجئے' مسلم لیگ کی دعوت کو **کونوا عباد الله اخوانا** کی دعوت سمجھنا صریح غلطی ہے۔ مولانا مودودی صاحب نے میرے موقف کو صحیح تسلیم کر لیا اور میرے اور ان کے درمیان صلح ہو گئی۔ اس کے بعد مولانا منظور نعمانی صاحب مجھ سے سرائے میر' مدرستہ الاصلاح میں جا کر ملے اور انہوں نے مجھ سے کہا کہ اب تمہارے اور مودودی صاحب کے نقطۂ نظر میں اتفاق ہو گیا ہے لہٰذا اب اگر **کونوا عباد الله اخوانا** کی دعوت کے لیے کوئی جماعت قائم ہو تو کیا تم اس میں شریک ہو گے؟ میں نے کہا میرے پیش نظر اور کام ہیں' اس لیے میں شریک تو نہیں ہوں گا تاہم میں اس کام کو مبارک سمجھتا ہوں' یہ کام ہونا چاہیے اور آپ حضرات یہ کام کیجئے۔ لیکن انہوں نے مجھ پر دباؤ ڈالنا شروع کر دیا اور یہ اصرار کیا کہ میں ایک دفعہ لاہور میں مودودی صاحب سے ملاقات کروں۔ میں اس پر راضی نہیں ہوتا تھا لیکن مولانا منظور نعمانی صاحب بہت مصر ہوئے۔ وہی درحقیقت اصرار کر کے مجھے لاہور لائے اور میرے اور مولانا مودودی صاحب کے درمیان ملاقات ہوئی۔ اس وقت تک جماعت قائم نہیں ہوئی تھی۔

ملاقات کے بعد مولانا منظور نعمانی صاحب نے مجھ سے پوچھا' اب تمہاری مولانا مودودی سے ملاقات ہو گئی ہے۔ تم نے ان کے بارے میں کیا رائے قائم کی ہے۔ میں خاموش رہا۔ انہوں نے پھر پوچھا' تب بھی میں خاموش رہا۔ جب تیسری بار پوچھا تو میں نے کہا **دع شانہ' یا مولانا لا فرق بینہ و بین پرویز'** (ان کا قصہ چھوڑیے۔ ان کے اور پرویز کے درمیان کوئی فرق نہیں)۔ یہاں یہ بات ملحوظ رہے کہ اس زمانے



میں پرویز کے مضامین مفید نکلتے تھے اور وہ "ترجمان القرآن" اور "الاصلاح" دونوں میں شائع ہوتے تھے۔ میرا مطلب یہ تھا کہ وہ بس پرویز کی طرح اچھے مضمون نگار ہیں۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ اس پر مولانا منظور نعمانی صاحب کہنے لگے۔ دیکھو! اب اسماعیل شہید اور سید احمد شہید جیسے لوگ نہیں ملیں گے۔ اب تو کام چلاؤ آدمی چاہیے۔ اس لیے اگر کوئی شخص اس کام کے لیے اٹھ کھڑا ہو تو اس کا ساتھ دینا چاہیے۔ میں نے کہا آپ حضرات ساتھ دیجئے اور کام بھی کیجئے۔ میں کب کہتا ہوں کہ اسماعیل شہید اور سید صاحب جیسے لوگ نہ ملیں تو کام ہی نہ ہو۔ میں نے کہا میں اس مسئلہ پر غور کروں گا لیکن آپ حضرات یہ کام کریں' میں اس میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈالوں گا۔

اس کے بعد کچھ حضرات نے مل کر لاہور میں جماعت کی بنیاد رکھی اور جماعت میں شامل ہونے والوں میں میرا نام بھی دے دیا۔ میں اس اجلاس میں آیا تھا نہ شریک ہوا تھا۔ اس کے باوجود میرا نام دے دیا گیا اور وہ چھپ بھی گیا۔ جب مولانا سید سلیمان ندوی صاحب کو اطلاع ہوئی تو انہوں نے مجھے بلایا اور کہا کہ تم تو گئے نہیں تھے' تمہارا نام کیسے آ گیا؟ میں نے کہا اب آ گیا ہے تو کیا کیجئے گا' رہنے دیجئے۔ دراصل میں مولانا منظور نعمانی صاحب کی مروت میں آ گیا کہ انہوں نے میرے اعتماد پر نام دے ہی دیا ہے تو اب یہ ٹھیک نہیں کہ میں اس کی تردید کروں۔ سید سلیمان صاحب کہنے لگے میں تردید کئے دیتا ہوں کہ یہ تو گیا نہیں اس کا نام غلط دے دیا گیا ہے۔ "میں نے کہا کاہے کو تردید کرتے ہیں۔ کوئی دینی کام ہی ہو گا' کوئی غیر دینی کام تو نہیں ہو گا"۔ بہرحال اس کو کمزوری کہئے یا کچھ اور' میرا نام دے دیا گیا اور میں نے مولانا منظور نعمانی صاحب کی مروت میں اس کی تردید نہیں کی۔

نام آ جانے کے فوراً بعد مجھ سے یہ اصرار کیا جانے لگا کہ جماعت قائم ہونے کے بعد جماعت کا نظام بہت وسیع ہو رہا ہے لہٰذا تمہارا جماعت کے ساتھ پٹھان کوٹ میں قیام نہایت ضروری ہے۔ میں نے معذرت کی کہ میرے لیے مدرسہ چھوڑنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ مجھے مولانا فراہی کے کاموں کو انجام دینا ہے۔ پچاس ہزار روپے صرف اس مقصد کے لیے میرے پاس جمع ہیں اور اس کی ذمہ داری مجھ پر ہے۔ اس لیے یہ ممکن نہیں ہے۔ لیکن مولانا مودودی صاحب مرحوم اور مولانا نعمانی صاحب دونوں میرے درپے ہو گئے کہ تمہارا یہاں آنا بہت ضروری ہے۔ مولانا مودودی صاحب نے نہایت مدلل خطوط لکھنے شروع کر دیئے کہ تنہا میرے لیے ساری ذمہ داریوں کو سنبھالنا مشکل ہے۔ اس لیے پٹھان کوٹ میں تمہارا مستقل قیام ضروری ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مجھے وہاں کی بساط لپیٹنی پڑی بلکہ وہ کشتی ہی جلانی پڑی اور میں پٹھان کوٹ آ گیا۔ میں جماعت اسلامی میں اس طرح شامل ہوا ہوں۔ کسی کی عقیدت کے تحت' یا کسی غلط فہمی کی بنا پر شامل نہیں ہوا۔

مولانا مودودی مرحوم اور میرے درمیان ایک قدر مشترک بھی موجود تھی۔ اور وہ یہ کہ تقلید و تقید

سے میں بھی آزاد تھا اور تقلید و تنقید سے وہ بھی آزاد تھے۔ بعد میں جماعتی مصالح کے تحت انہوں نے نجانے کتنی بیڑیاں پہن لیں اور ان سب مسائل کے ایک ایک کرکے قائل ہو گئے جن کا ہم پٹھان کوٹ میں مذاق اڑایا کرتے تھے۔ لیکن اس زمانے میں میرے اور ان کے سوچنے کے انداز میں کوئی خاص فرق نہیں تھا۔ دینی معاملات پر ہم دونوں ایک ہی طرز پر سوچتے تھے یعنی قرآن مجید پر اس طرح غور کیا جائے' فقہ پر اس طرح سے غور ہونا چاہیے' علما کو اس راستہ پر لایا جائے اور لوگوں کو یوں تبدیل کیا جائے۔ ان تمام مسائل میں' میرے اور ان کے سوچنے کا انداز تقریباً ایک ہی تھا۔

تاہم اس قدر مشترک کے علاوہ میرے اور ان کے درمیان ایک نہایت گہرا ذوق و فکر کا اختلاف بھی تھا۔ مولانا حمید الدین کی فکر سے نہ ان کو دلچسپی تھی نہ یہ کام ان کے بس کا تھا۔ تاہم یہ اختلاف ایسا نہیں تھا کہ میں ان سے تعاون نہ کر سکوں۔ چنانچہ جماعت سے میرا جو تعلق قائم ہو گیا تھا میں نے اسے قائم رکھنا چاہا الا آں کہ ایسے حالات پیدا ہو جائیں کہ میرے لیے اس تعلق کو برقرار رکھنا ناممکن ہو جائے۔

سوال: براہ کرم یہ بتایئے کہ وہ کیا وجوہ تھیں جن کی بناء پر آپ مجبور ہو گئے کہ جماعت اسلامی سے استعفیٰ دے دیں۔

جواب: جماعت سے میری علیحدگی کے متعلق آپ کے سوال کا جواب تھوڑی سی تفصیل چاہتا ہے۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے کہ مولانا مودودی صاحب اور میرے درمیان ایک ذوق و فکر کا اختلاف شروع ہی سے رہا ہے لیکن یہ کوئی ایسا اختلاف نہیں تھا کہ میں ان کے ساتھ تعاون نہ کر سکوں۔ جماعت کی مجلس شوریٰ میں میری رائے بہت موثر تھی۔ اس بناء پر میں' صحیح یا غلط' یہ محسوس کرتا تھا کہ میں جماعت کی پالیسی کو بحیثیت مجموعی کسی غلط راہ پر جانے سے روک سکتا ہوں۔ اس لیے اس ذوق و فکر کے اختلاف کے باوجود جماعت سے میرا جو تعلق قائم ہو گیا تھا میں نے اسے برقرار رکھنا چاہا۔

قیام پاکستان کے بعد مجھے محسوس ہوا کہ مولانا مودودی صاحب میں کچھ ایسی تبدیلیاں ہو گئی ہیں جو بالآخر گمراہ کن نتائج تک منتہی ہو سکتی ہیں۔ مثال کے طور پر میں نے یہ محسوس کیا کہ وہ جو جتھہ بندی قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں اب جلد سے جلد اس جتھہ بندی کی قیمت وصول کرنا چاہتے ہیں۔ دوسری چیز یہ تھی کہ ان کے بعض معتقدین نے انہیں یہ باور کرا دیا کہ اب اس ملک کے عوام مسلم لیگی قیادت کو آپ کی قیادت سے تبدیل کرنا چاہتے ہیں اور اس کے لیے لوگوں میں بے چینی پائی جاتی ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ یہ خیال واقعی مولانا کے اندر جڑ پکڑ گیا ہے اور وہ ایسا سمجھنے لگے ہیں۔ تیسری چیز یہ تھی کہ ان کے بعض غالی عقیدت مندوں نے انہیں یہ باور کرا دیا کہ تحریکیں صرف اصول اور نظریات پر نہیں چلا کرتیں بلکہ اس کے لیے شخصیت کی ضرورت ہوتی ہے' اور شخصیت آپ سے آپ نہیں بنتی' بنائی جاتی



ہے۔ اس لیے جب تک ہم آپ کے لیے وہ تمام لوازم اختیار نہیں کریں گے جو شخصیت بنانے کے لیے ضروری ہیں تب تک یہ کام آگے نہیں بڑھ سکتا۔ واقعہ یہ ہے کہ مولانا مودودی صاحب پر ان کے ساتھیوں کا یہ جادو بھی کارگر ہو گیا تھا۔

میرے علم میں جب یہ باتیں آئیں تو مولانا سے مختلف ملاقاتوں میں یہ واضح کرنے کی کوشش کی کہ یہ محض ایک وسوسہ ہے کہ اس ملک کے عوام آپ کی قیادت سے مسلم لیگ کی قیادت کو بدلنا چاہتے ہیں۔ یہ بہت دور کی چیز ہے' اس کا فی الحال کوئی امکان نہیں۔ میں نے یہ بھی سمجھانے کی کوشش کی کہ اس میں تو کوئی شبہ نہیں کہ تحریکیں شخصیت سے چلتی ہیں لیکن شخصیت مصنوعی طور پر نہیں بنائی جاتی بلکہ خدمت سے آپ سے آپ بنتی ہے۔ آپ جو خدمت کر رہے ہیں یہی خدمت آپ کو بنائے گی اور اگر اس مقصد کے لیے مصنوعی طریقے اختیار کیے گئے تو اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ آپ کے لیے وہ تمام چیزیں اختیار کی جائیں گی جو موجودہ زمانے میں لیڈری کے لوازم و خصوصیات میں سمجھی جاتی ہیں اور جنہیں آپ حرام سمجھتے ہیں۔

مولانا مودودی صاحب میری یہ باتیں حسب عادت نہایت توجہ سے سنتے اور مجھے اطمینان دلاتے کہ میں ایسی غلط فہمی میں نہیں ہوں' مگر حقیقت میں وہی سب کچھ ہونے لگا جس کی طرف میں ان کو توجہ دلاتا رہا تھا۔ چنانچہ لیڈروں والے سارے لوازم اختیار کیے گئے' ہر قدم پر تصویریں لی جانے لگیں۔ جہاں جاتے وہاں پہلے سے اطلاع پہنچ جاتی کہ استقبال کیا جائے: اسٹیشن پر لوگ آئیں اور خیرمقدم کے نعرے لگائیں۔ ان چیزوں سے میرا یہ احساس قوی ہو گیا کہ گاڑی اب اسی راستے پر چل نکلی ہے۔ تاہم کوئی ایسی بات نہیں ہوئی جو مجھے مجبور کر دیتی کہ میں جماعت سے الگ ہو جاتا۔ میں اپنے آپ کو شوریٰ میں ایک موثر وجود سمجھتا تھا اور میرا خیال تھا کہ میں انشاء اللہ جماعت کو بحیثیت مجموعی کسی غلط راستے پر جانے نہیں دوں گا۔ بالآخر پنجاب کے پہلے الیکشن کا مرحلہ پیش آگیا۔

اس وقت میری اور میرے بعض ہم خیال دوستوں کی رائے یہ تھی کہ فی الوقت الیکشن میں حصہ لینا جماعت کے لیے فائدہ مند نہیں ہو گا۔ لیکن چونکہ مولانا مودودی صاحب کا ذہن الیکشن لڑنے کے لیے پوری طرح تیار ہو چکا تھا اس لیے ہم شدت کے ساتھ اس کی مخالفت بھی نہیں کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ الیکشن میں مولانا مودودی صاحب ایک سیاسی پارٹی کی حیثیت سے میدان میں اتر گئے اور ان کے وہ ساتھی جو ایسے ہی کسی موقع کے انتظار میں تھے' الیکشن میں پوری طرح سرگرم عمل ہو گئے۔ لیکن نتیجہ یہ نکلا کہ الیکشن میں شریک ہو کر جماعت نے ان تمام اخلاقی و مذہبی اصولوں کو پامال کر دیا جن کا وہ اب تک اعلان کرتی رہی تھی۔ بحیثیت ایک سیاسی جماعت وہ کوئی کامیابی نہ حاصل کر سکی۔ بلکہ جتنے لوگ جماعت کے امیدوار کی حیثیت سے میدان میں اترے تھے ان میں سے شاید کوئی صاحب بھی اپنی ضمانت واپس نہیں لے سکے۔

اخلاقی حیثیت سے جماعت نے جن سنگین غلطیوں کا ارتکاب کیا ان کی وجہ سے جماعت میں ایک شدید قسم کا بحران پیدا ہو گیا کہ ہم کس لیے اٹھے تھے' ہمارے دعوے کیا تھے' آج تک کیا اعلان کرتے رہے اور کس طرح ایک ہی آزمائش میں سب کچھ کھو کر رکھ دیا۔ اس بحران کے نتیجہ میں جب ایک بددلی سی پیدا ہوئی تو مجلس شوریٰ نے غالباً 1956ء کے اوائل میں چند ارکان پر مشتمل ایک جائزہ کمیٹی مقرر کی تھی جس کے سپرد یہ کام کیا گیا تھا کہ وہ تمام حالات کا جائزہ لے کر مفصل رپورٹ شوریٰ میں پیش کرے۔ لیکن امیر جماعت مولانا مودودی صاحب اس جائزہ کمیٹی کی تشکیل پر بہت برہم ہوئے اور انہوں نے دوسرے اعتراضات کے علاوہ یہ اعتراض بھی کیا کہ اس کمیٹی کو مرکزی تنظیم کے محتسب کی حیثیت دے دی گئی ہے حالانکہ اس میں بعض ارکان بہت ناپسندیدہ ہیں۔ چنانچہ یہ کمیٹی مولانا مودودی صاحب کے مسلسل مطالبے کی بناء پر توڑ دی گئی۔ پھر مجلس شوریٰ نے چار سینئر ارکان غازی عبد الجبار' شیخ سلطان احمد' حکیم عبد الرحیم اشرف اور مولانا عبد الغفار حسن صاحب پر مشتمل ایک اور کمیٹی مقرر کی جس کے سپرد بھی یہی کام کیا گیا۔

اس جائزہ کمیٹی نے پورے ملک کا دورہ کیا' ہر جگہ ارکان جماعت کے بیانات لئے اور کئی مہینوں کی محنت شاقہ کے بعد ایک رپورٹ مرتب کی۔ جب یہ رپورٹ مرتب ہو کر امیر جماعت کو ملی تو بدقسمتی سے امیر جماعت نے اسے اپنے خلاف ایک چارج شیٹ سمجھ لیا۔ تاہم جب شوریٰ میں یہ رپورٹ پیش ہوئی تو شوریٰ نے' جس کے صدر مولانا مودودی صاحب تھے' متفقہ طور پر جائزہ کمیٹی کے ارکان کی خدمات کو سراہا' ان کا شکریہ ادا کیا اور چار شقوں پر مشتمل ایک قرارداد منظور کی جس میں یہ اعتراف کیا گیا کہ کچھ غلطیاں ہوئی ہیں لیکن وہ ایسی غلطیاں نہیں ہیں جن پر قابو نہ پایا جاسکے' آئندہ احتیاط کی ضرورت ہے۔ اس قرارداد کی ایک نہایت اہم شق یہ تھی کہ عام انتخابات کی سرگرمیوں سے فی الحال صرف نظر کر کے معاشرے کی اصلاح پر زیادہ زور دیا جائے کیونکہ اسلامی خطوط پر معاشرے کی اصلاح ہی بالآخر ملک میں صحیح سیاسی تبدیلی کا ذریعہ بن سکے گی۔ اس قرارداد کو متفقہ طور پر منظور کر لینے کے بعد مجلس شوریٰ کا اجلاس دعا و درود پڑھ کر ختم کر دیا گیا۔

اس قرارداد کو منظور کر لینے کے بعد میرے نزدیک مجلس شوریٰ نے اس بحران پر جو انتخابات میں حصہ لینے سے پیدا ہو گیا تھا' قابو پا لیا تھا۔ لیکن مولانا مودودی صاحب نے اس قرارداد کو دل سے نہیں مانا نیز یہ خلش بھی ان کے دل سے نہیں نکلی کہ جائزہ کمیٹی کی رپورٹ ان کے خلاف ایک چارج شیٹ ہے۔ چنانچہ شوریٰ کے اجلاس کے ختم ہونے کے کچھ ہی دن بعد انہوں نے جائزہ کمیٹی کے چاروں ارکان کو ایک نوٹس بھیج دیا کہ چونکہ آپ حضرات ایک نادانستہ سازش کے مرتکب ہوئے ہیں اس لیے شوریٰ سے استعفیٰ دیں ورنہ میں آپ کے حلقے کے ارکان کو لکھوں گا کہ وہ آپ کو واپس بلا لیں۔



میں گذشتہ کئی برسوں سے یہ محسوس کر رہا تھا کہ مولانا مودودی صاحب شورائیت کو' جو اسلامی نظام کی بنیادی خصوصیت ہے' جماعتی معاملات میں اہمیت نہیں دیتے لیکن اس واقعہ نے میرے اعتماد کو بالکل ہی متزلزل کر دیا۔ کیونکہ مولانا مودودی صاحب کا یہ اقدام دستور جماعت ہی نہیں' عدل و انصاف کے ابتدائی تقاضوں کے احترام سے بھی خالی تھا۔ چنانچہ میں نے اس صریح ناانصافی اور جماعتی مصالح کے لحاظ سے مہلک فیصلہ پر ان کو توجہ دلانے کی کوشش کی اور ان کے سامنے یہ واضح کیا کہ آپ کا یہ فیصلہ ہر پہلو سے غلط ہے۔ اس لیے جن کو آپ کے احکام پہنچ گئے ہیں' انہیں واپس لیجئے اور جن تک نہیں پہنچے' انہیں روک دیجئے ورنہ یہ چیز بڑے حادثے پر منتج ہو گی۔ مولانا مودودی صاحب مجھے تسلی دیتے رہے کہ اس پر غور کیا جائے گا لیکن عملاً وہ اسی پر مصر رہے۔ تب میں نے ان کو ایک مفصل خط لکھا جس میں میں نے ان کی توجہ اس حقیقت کی طرف مبذول کرائی کہ امیر جماعت کی حیثیت سے ان کا یہ اقدام دستور ہی کے نہیں' عدل و انصاف کے بھی خلاف ہے۔

میرا یہ خط ایک تاریخی خط ہے جو اس زمانے میں پریس میں بھی آ گیا تھا اور جسے پڑھ کر عمر بہاء الامیری نے' جو اس زمانے میں پاکستان میں شام کے سفیر ہوا کرتے تھے' کہا تھا **قد کتبت ھذا الکتاب کما یکتب القاضی قضاءہ ولکن فیہ بعض الخشونہ** (آپ نے خط ایسے لکھا ہے جیسے قاضی اپنا فیصلہ لکھتا ہے لیکن ذرا تلخ ہے) مولانا مودودی صاحب نے مجھے اس خط کا کوئی جواب نہیں دیا بلکہ اگلے روز نہایت عجیب و غریب انداز سے جماعت کی امارت سے مستعفی ہو گئے۔

کچھ عرصہ سے' مولانا مودودی صاحب نے شوریٰ کے اجلاسوں میں یہ طرز عمل اختیار کر رکھا تھا کہ جب بھی وہ اپنے موقف کو دلائل کے ذریعے منوانے میں ناکام رہتے تو فوراً استعفیٰ کی دھمکی دے دیتے۔ وہ اس سے پہلے شوریٰ کے اجلاسوں میں کئی بار استعفیٰ کی دھمکی دے چکے تھے اور اس کا مقصد شوریٰ کو مرعوب کرنا اور دیگر ارکان کو یہ تاثر دینا ہوتا تھا کہ اختلاف کرنے والے حضرات امیر جماعت کی دل شکنی کا باعث بھی بن رہے ہیں۔ چنانچہ اس دفعہ جب انہوں نے استعفیٰ دیا تو جماعت کی مجلس شوریٰ نے بالاتفاق یہ طے کیا کہ استعفیٰ کو نہایت خفیہ رکھا جائے لیکن مرکزی سٹاف نے اسے نہایت دھوم دھام سے اخبارات میں شائع کرا دیا اور جگہ جگہ عام ارکان کو یہ تاثر بھی دیا گیا کہ درحقیقت میری کوئی گستاخی ہے جو جماعت کے لیے اس حادثے کا باعث بنی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ جماعت کے بیشتر حلقوں میں جائزہ کمیٹی کے ارکان اور ان سے ہمدردی رکھنے والے دیگر حضرات کے خلاف بہتان طرازیوں کی ایک مکروہ مہم شروع ہو گئی۔

اس استعفیٰ پر غور کرنے کے لیے مجلس شوریٰ کا ایک ہنگامی اجلاس منعقد ہوا جس میں چند ایسے ارکان جن کی رکنیتیں اس عرصہ میں معطل کر دی گئی تھیں' شریک نہیں تھے۔ اس شوریٰ نے امیر

جماعت پر غیر مشروط اعتماد کا اظہار بھی کیا اور امیر جماعت کو خوش کرنے کے لیے پالیسی میں بھی مداخلت کر دی جس کا اسے کوئی اختیار نہیں تھا۔ میں اس شوریٰ میں شریک نہیں تھا۔ چونکہ میں امیر جماعت پر شوریٰ کے غیر مشروط اظہار اعتماد کو 'امیر جماعت کے ان تمام فیصلوں کی توثیق سمجھتا تھا' جو انہوں نے جائزہ کمیٹی کے ارکان کے خلاف کیے اس لیے میں نے اس دوران جماعت سے استعفیٰ دے دیا۔ میرے استعفیٰ کے بعد چودھری غلام محمد صاحب جو اس وقت قائم مقام امیر بنائے گئے تھے' مولانا باقر خان صاحب کے ساتھ مجھے ملے اور مجھے یہ یقین دلایا کہ اس شوریٰ کے اظہار اعتماد کا مطلب' ہرگز ہرگز امیر جماعت کے جائزہ کمیٹی کے ارکان کے خلاف اقدامات کی توثیق نہیں ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ دسمبر کی شوریٰ کی قرارداد اپنی جگہ قائم ہے۔ نیز یہ کہ امیر جماعت جائزہ کمیٹی کے ارکان کو بھیجے گئے نوٹس کو نہ صرف واپس لیں گے بلکہ ان سے معافی بھی مانگیں گے۔ ان حضرات کی ان یقین دہانیوں کے بعد میں نے اپنا استعفیٰ واپس لے لیا۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ یہ حضرات ان وعدوں میں سے کسی بھی وعدے میں سچے ثابت نہیں ہوئے۔

شوریٰ کی اس قرارداد کے بعد مولانا مودودی صاحب نے اپنے اس استعفیٰ کو جس میں کہا گیا تھا کہ یہ کسی بھی صورت میں واپس نہیں ہو گا' صرف تین ہی دن کے بعد واپس لے لیا۔ لیکن جائزہ کمیٹی کے ارکان کے بارے میں وہ اپنے اسی فیصلے پر جمے رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ چاروں اراکین شوریٰ الگ کیے گئے اور ان کے ساتھ ہی کئی دوسرے حضرات نے بھی بددل ہو کر جماعت سے استعفیٰ دے دیا۔ وہ شوریٰ ختم ہو گئی جو مولانا مودودی صاحب کے نقطہ نظر سے اختلاف کر سکتی تھی۔ صرف وہ لوگ رہ گئے جن کا خیال یہ تھا کہ دین لائے تو رسول اللہ ﷺ ہیں' لیکن اس زمانے میں اسے صرف مولانا مودودی صاحب ہی نے سمجھا ہے۔

اگرچہ ایسی خوشامدی اور جی حضوری قسم کی شوریٰ سے کسی اختلاف کی توقع رکھنا عبث تھا' پھر بھی مولانا مودودی صاحب نے کسی متوقع سرکشی سے بچنے کے لیے جماعت میں اسلامی شورائیت کے نظام کو بدل کر ایک آمرانہ اور ڈکٹیٹرانہ نظام نافذ کر دیا۔ چنانچہ ماچھی گوٹھ کے اجتماع ارکان میں انہوں نے مختلف طریقوں سے دستور میں ایسی ترامیم کرائیں جن کی رو سے شوریٰ کو عاملہ کی بجائے ایک مشاورتی کونسل کی حیثیت دے دی گئی۔ چند ماہ بعد اس نئی شوریٰ کا اجلاس کوٹ شیر سنگھ میں ہوا اور اس میں مولانا مودودی صاحب نے اپنے لیے ان اختیارات کا مطالبہ کیا جو حالت جنگ میں کسی فوج کے سپہ سالار کو حاصل ہوتے ہیں۔ اور ساتھ ہی یہ دھمکی بھی دی کہ اگر انہیں یہ اختیارات نہ دیئے گئے تو وہ جماعت کی امارت سے استعفیٰ دے دیں گے۔ میں نے ان کی اس رائے پر تنقید کی تھی لیکن شوریٰ نے ان کے استعفیٰ کی دھمکی کے سامنے گھٹنے ٹیک دیئے۔ میں شوریٰ کے اس اجلاس سے اٹھ کر چلا آیا اور بعد میں دستور میں وہ تمام ترامیم کر دی گئیں جن کے بعد جماعت کا جمہوری اور شورائی نظام ایک آمرانہ اور ڈکٹیٹرانہ نظام میں بدل



گیا۔ ترمیم شدہ دستور کے مطابق چند ارکان پر مشتمل عاملہ بنائی گئی جسے بظاہر وسیع اختیارات دیئے گئے لیکن عملاً یہ تمام اختیارات امیر جماعت کی ذات میں مرتکز کر دیئے گئے کیونکہ اس دستور کے مطابق اب امیر جماعت عاملہ کی اکثریت کی رائے کے پابند نہیں تھے اور وہ ساری عاملہ یا عاملہ کے چند ارکان کو جب چاہیں معزول کر سکتے تھے۔

جب معاملہ یہاں تک پہنچ گیا تو مجھ پر یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو گئی کہ اب جماعت کا دستور' نظام' پالیسی ہر چیز بدل چکی ہے۔ یہ جماعت اقامت دین کے لیے اٹھی تھی اور اس کے لیڈروں نے اسے اٹھا کر غلط راستے پر ڈال دیا۔ ان کی انتہائی آرزو بس یہی تھی کہ کسی طرح اسمبلی کی چند سیٹوں پر قبضہ کر لیں۔ شہادت حق اور اقامت دین کے نعرے کھوکھلے ہو چکے تھے۔ میں نے اس کے اندر رہ کر اصلاح کرنے کی ہر ممکن کوشش کی لیکن کامیاب نہیں ہو سکا۔ میرے لیے یہ بھی ممکن نہیں تھا کہ میں امیر جماعت کے ان اقدامات کو جو انہوں نے جائزہ کمیٹی کے ارکان کے خلاف کیے' خاموشی سے برداشت کر لیتا۔ اگر میں اس ظلم اور ناانصافی پر خاموش رہتا تو میرا ضمیر مردہ ہو جاتا اور میری روح خدا سے شرمندہ ہوتی۔ اس دوران میں کچھ لوگوں نے مصالحت کی کوششیں کیں لیکن جب وہ بھی مایوس ہو گئے تو میں نے استعفیٰ دے دیا۔ اور آخر میں یہ بھی لکھ دیا کہ یہ استعفیٰ واپس لینے کے لیے نہیں ہے۔ مولانا مودودی صاحب میرے پاس آئے اور کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ آپ اپنا استعفیٰ واپس لیں۔ میں نے کہا مولانا! میں نے تو عرض کر دیا ہے کہ یہ استعفیٰ واپس لینے کے لیے نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ میں نے آپ کو اچھی طرح جان لیا اور آپ نے مجھے اچھی طرح جان لیا۔ اب ہم شاید کبھی بھی مجتمع نہیں ہو سکیں گے۔ **هذا فراق بيني و بينك**۔ مولانا مودودی صاحب اٹھ کر چلے گئے اور جماعت سے میری علیحدگی ہو گئی۔

سوال: آپ کے استعفیٰ دینے کا فوری سبب کیا چیز بنی؟

**جواب:** مولانا مودودی صاحب نے ایک خط چودھری غلام محمد صاحب کو لکھا اور اس میں میرے متعلق یہ لکھا کہ میں نے جتنی ناز برداری مولانا اصلاحی کی ہے اتنی کسی اور کی نہیں کی۔ لیکن کچھ عرصہ سے مولانا کا رویہ یہ ہے کہ وہ میرے خاص احباب پر برابر دل شکن فقرے کستے رہتے ہیں۔ اس خط کو مجھے بھیجنے کی ضرورت نہیں تھی لیکن مولانا مودودی صاحب نے اس کی ایک نقل مجھے بھی بھیج دی۔ اسے پڑھ کر مجھے احساس ہوا کہ میں نے استعفیٰ دینے میں دیر لگائی ہے' چنانچہ میں نے استعفیٰ لکھا اور اس خط کے جواب میں یہ بھی لکھا کہ اگر آپ نے نازبرداری ایسے شخص کی کی جو اس کا اہل نہیں تھا تو آپ اپنے آپ کو کوسیئے' اور اگر وہ اس کا اہل تھا تو آپ نے کوئی احسان نہیں کیا۔ اس لیے اس ناز برداری کو جتلا کر مجھ سے یہ توقع نہ رکھیں کہ میں اس کے بدلے میں ضمیر فروشی کروں گا۔

سوال: کیا مولانا مودودی صاحب کو دستور کے تحت یہ حق حاصل نہیں تھا کہ وہ جائزہ کمیٹی کے ارکان سے استعفیٰ کا مطالبہ کر سکیں؟

جواب: مولانا مودودی صاحب نے استعفیٰ کا مطالبہ دستور کے تحت نہیں کیا تھا بلکہ یہ ایک مطلق العنانہ حکم تھا۔ اور اس کی دلیل انہوں نے یہ دی تھی کہ چونکہ میں امیر جماعت ہوں اس لیے مجھ پر یہ عظیم ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ میں جماعت کو کسی سازش کا شکار ہونے سے بچاؤں۔ اور چونکہ یہ چاروں حضرات ایک نادانستہ سازش کے مرتکب ہوئے ہیں لہٰذا میں ان کو حکم دیتا ہوں کہ وہ مستعفی ہو جائیں۔ یہ حکم وہ دستور کے تحت نہیں دے سکتے تھے۔ میں نے اسی پر احتجاج کیا تھا کہ یہ حکم دستوری کے نہیں' عدل و انصاف کے بھی خلاف ہے۔ ان کے بعض سادہ لوح معتقدین یہ کہنے لگے کہ اگر امیر جماعت کسی سے مستعفی ہونے کے لیے کہیں تو مستعفی ہو جانا چاہیے۔ میں نے کہا اگر کسی سے یہ کہا جائے کہ آپ نے سازش کی ہے اس لیے مستعفی ہو جائیں تب تو یہ ایک جرم بنتا ہے۔ پہلے جرم ثابت کرنا چاہیے پھر یہ حکم دینا چاہیے۔ اصل میں شخصی آمریتوں کے دور میں جس طرح دستور بھی موجود ہوتا ہے اور ایک بالاتر قانون بھی چل رہا ہوتا ہے جو آمریت کے ہر فعل کو قانونی جواز فراہم کرتا ہے اسی طرح یہ قدم بھی دستور کے تحت نہیں بلکہ اسی بالاتر قانون کے تحت اٹھایا گیا تھا جسے دنیا کے ہر آمر اور ڈکٹیٹر نے اپنے مفاد کے لیے وضع کر رکھا ہے۔

سوال: ماچھی گوٹھ کے اجتماع ارکان میں کیا پالیسی طے ہوئی تھی؟

جواب: دراصل مولانا مودودی صاحب نے اپنا استعفیٰ اس شرط پر واپس لیا تھا کہ وہ اس کو اجتماع ارکان میں رکھیں گے۔ اس استعفیٰ کی وجہ سے ارکان پر شدید دباؤ تھا اور ان کی اکثریت کے ذہن مفلوج تھے۔ اسی صورت حال میں مولانا مودودی صاحب جماعت کی پالیسی کے بارے میں ایک قرارداد استصواب کے لیے پیش کرنا چاہتے تھے۔ اجتماع عام سے پہلے شوریٰ کے اجلاس میں جب یہ قرارداد میرے سامنے آئی تو میں نے اس پر شدید تنقید کی جس پر شوریٰ کے اجلاس میں تعطل پیدا ہو گیا۔ بالآخر چوبیس گھنٹوں کے بعد مولانا باقر خان صاحب میرے پاس قرارداد لے کر آئے اور کہا کہ امیر جماعت فرماتے ہیں کہ اگر تم اس میں کوئی لفظی ترمیم کرنا چاہتے ہو تو کر دو۔ اگرچہ کسی لفظی ترمیم سے میرا مدعا حاصل نہیں ہوتا تھا' تاہم محض اس خیال سے کہ جماعت میں انتشار نہ پیدا ہو' میں نے اس قرارداد میں ذرا سی لفظی ترمیم کر کے اسے جماعت کے اصل مقصد کے قریب تر لانے کی کوشش کی اور بعد میں یہ کثرت رائے سے منظور ہو گئی۔ اس قرارداد کے چار جزو تھے اور فیصلہ کیا گیا تھا کہ جماعتی سرگرمیوں کے ان چاروں اجزاء میں توازن رکھا جائے گا۔ اس قرارداد کا بنیادی فلسفہ بھی یہی تھا کہ اصلاح معاشرہ ہی ملک میں صحیح سیاسی تبدیلی کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ لیکن



مولانا مودودی صاحب نے اس قرارداد پر وفاداری سے عمل نہیں کیا اور ان کی روش یہی رہی کہ جماعت کی تمام سرگرمیاں انتخابات کے لیے مخصوص رہیں۔

سوال: کیا مولانا مودودی صاحب سے اختلاف رکھنے والے حضرات جماعت کے سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے کے خلاف تھے؟

جواب: اختلاف رکھنے والے حضرات جماعت کے سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے کے خلاف نہیں تھے۔ وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ جماعت کبھی بھی سیاست میں حصہ نہ لے بلکہ ان کی خواہش یہ تھی' اور یہی شوریٰ نے طے کیا تھا' کہ فی الحال سیاسی سرگرمیاں معطل کر دی جائیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اس بات کی اس وقت کوئی گنجائش بھی نہیں تھی۔ جماعت کی طاقت اتنی نہیں تھی کہ وہ ایک سیاسی جماعت کی حیثیت سے میدان میں اتر جائے۔ ہمارا خیال یہ تھا کہ فی الحال سیاسی سرگرمیوں کو کم کر کے' تعلیم' تربیت اور تنظیم کے کام کو آگے بڑھایا جائے تاکہ جماعت کی قوت اتنی بڑھ جائے کہ یہ ملکی سیاست پر موثر طریقے سے اثر انداز ہو سکے۔ پھر اگر ممکن ہو تو سیاست میں براہ راست حصہ بھی لیا جائے۔ جماعت کے سیاست میں حصہ لینے پر کبھی بھی کسی کو اعتراض نہیں رہا۔ یہ تو محض مجرم بنانے کے لیے کہا جانے لگا کہ یہ حضرات اس کو تبلیغی جماعت بنانا چاہتے تھے۔

سوال: جب آپ جماعت میں شامل ہوئے تو اس وقت جماعت کا نصب العین کیا تھا؟

جواب: اس وقت' واقعہ یہ ہے کہ ہم انبیاء کے طریقے پر اقامت دین کرنے کے لیے ہی اٹھے تھے۔ اس وقت ہماری تحریروں میں' تقریروں میں' قول میں' عمل میں ہر چیز میں واضح طور پر بیان کیا جاتا تھا کہ ہمارا طریقہ اور ہمارا کام انبیاء کے طریقے پر اقامت دین ہے۔ لیکن ملک تقسیم ہونے کے بعد مولانا مودودی صاحب میں بعض تبدیلیاں رونما ہونا شروع ہو گئیں اور مجھے یہ محسوس ہونے لگا کہ وہ جو جتھہ بندی کرنے میں کامیاب ہو چکے ہیں اب اس کی قیمت وصول کرنا چاہتے ہیں۔ پھر جائزہ کمیٹی کے ارکان کے خلاف ان کے اقدام اور ماچھی گوٹھ کے اجتماع ارکان کے بعد ہر چیز نمایاں ہو گئی کہ اب وہ خالصتاً سیاسی پارٹی کی حیثیت سے کام کرنا چاہتے ہیں۔ انبیاءؑ کے طریقے پر اقامت دین کی بساط اب لپیٹ دی گئی ہے۔

سوال: کیا نصب العین میں انحراف کا اندازہ' جائزہ کمیٹی کی رپورٹ کے بعد ہوا تھا؟

جواب: جائزہ کمیٹی کی رپورٹ کے بعد وہ چیزیں جو نصب العین میں انحراف کا سبب بن سکتی تھیں اور زیادہ نمایاں ہو گئیں تھیں۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ الیکشن نے یہ واضح کر دیا کہ ہم جو وعدے کرتے تھے وہ یونہی لن ترانیاں تھیں اس لیے کہ الیکشن میں وہ تمام ہتھکنڈے جو ناجائز سمجھے جاتے تھے استعمال کیے گئے۔

اس وجہ سے جماعت پر پہلی بار یہ انکشاف ہوا کہ ہمارے دعوے کیا تھا اور ہم نے عمل کے میدان میں کیا کیا ہے۔

**سوال:** جماعت میں ان رجحانات کی اصلاح کے لیے، جو بالآخر اسے اپنے نصب العین سے ہٹانے کا سبب بنے، آپ نے کیا کوششیں کیں؟

**جواب:** جماعت میں نصب العین سے انحراف کو روکنے کے لیے، واقعہ یہ ہے کہ میں سب سے موثر شخص تھا۔ چنانچہ جب بھی کوئی ایسی بات ہوئی جسے میں نے محسوس کیا کہ یہ امیر جماعت یا جماعت کے ارکان میں غلط رجحان پیدا کر سکتی ہے تو میں نے اس پر فوراً توجہ دلائی۔ قیام پاکستان سے پہلے ہی جب جماعت کی دینی دعوت کو ایک دنیاوی تحریک کی صورت دی جانے لگی اور بے تکلفی سے یہ لکھا جانے لگا کہ اسلام ایک تحریک ہے اور آنحضرت ﷺ اس کے ایک لیڈر ہیں، تو میں نے اس پر اعتراض کیا تھا اور مولانا مودودی صاحب سے کہا تھا کہ یہ اصطلاحات نہ صرف عام آدمی کے ذہن کو خراب کرنے والی ہیں بلکہ دین کے وقار کو بھی بڑھانے کی بجائے گھٹانے کا باعث ہوں گی۔ کیونکہ تحریکیں تو دنیا میں بہت سی ہیں اور ان میں کئی شیطانی تحریکیں بھی ہیں لیکن دین تو ایک ہی ہے۔ اسی طرح لیڈر تو نجانے کتنے لوگ ہوئے ہیں لیکن خاتم الانبیاء تو آنحضرت ﷺ ہی ہیں۔ اس لیے یہ چیزیں دین کی دعوت کے بارے میں عام آدمی کے ذہن کو خراب کرنے کا باعث ہو سکتی ہیں۔ مولانا مودودی صاحب کہتے رہے کہ میرے اور تمہارے نقطہ نظر میں کوئی خاص فرق نہیں ہے لیکن وہ اور ان کے ہم خیال ساتھی اسی طرح لکھتے رہے۔ ان الفاظ کے کثرت استعمال سے چونکہ یہ اشتباہ پیدا ہوتا تھا کہ لوگوں کے ذہن دین کی دعوت کے بارے میں عام طرز کی دنیاوی تحریکوں کی طرف منتقل نہ ہو جائیں اور وہ لائحہ عمل کے لیے اسی نہج پر سوچنا نہ شروع کر دیں اس لیے میں نے اپنی تحریروں اور تقریروں میں اس پر بہت توجہ دلائی کہ ہمارا اصل فرض اقامت دین اور شہادت حق کا ہے اور ہمیں اس چیز سے بے پروا ہو جانا چاہیے کہ ہماری جدوجہد کا نتیجہ کیا نکلتا ہے۔ جماعت میں یہ اصطلاحات درحقیقت میرے توجہ دلانے ہی سے زیادہ فروغ پائی ہیں۔ اس زمانے میں میں نے خاص اسی لیے اپنی کتاب "دعوت دین اور اس کا طریق کار" لکھی۔ اس میں میں نے یہ واضح کیا کہ شہادت حق اور اقامت دین کی جو اصطلاحات قرآن مجید میں بیان ہوئی ہیں، ان کا مفہوم کیا ہے اور اس شہادت حق کی دعوت کے لیے قرآن مجید نے عام دنیاوی تحریکوں سے ہٹ کر جو راہ متعین کی ہے وہ کیا ہے؟

اسی طرح جب میں نے یہ دیکھا کہ یہ فلسفہ بنا لیا گیا ہے کہ تحریکیں اصول سے نہیں بلکہ شخصیت سے چلتی ہیں، اور جب تک شخصیت نہیں بنائی جائے گی تب تک یہ کام آگے نہیں بڑھ سکتا۔ تب میں نے



مولانا سے کہا کہ اول تو میں دین کے تحریک ہونے کے ہی مخالف ہوں، تاہم اگر یہ بات صحیح بھی ہو تو شخصیت اپنے عمل سے آپ سے آپ پیدا ہوتی ہے، مصنوعی طریقے سے نہیں بنائی جاتی، اور اگر مصنوعی طریقے سے بنائی گئی تو لیڈروں والے وہ تمام لوازم اختیار کرنے پڑیں گے جنہیں عام دنیادار لیڈر اختیار کرتے ہیں اور جنہیں آپ حرام سمجھتے ہیں۔ یہ چیزیں جماعت کی دینی دعوت کے مزاج کے سخت خلاف ہیں اور یہ رجحان صحیح نہیں ہے۔ افسوس یہ ہے کہ مولانا مودودی صاحب نے یہ چیز نہیں مانی بلکہ یہ قبول کر لیا کہ انہیں لیڈر ہی بننا ہے۔ چنانچہ لیڈروں والے وہ تمام لوازم اختیار کئے گئے جنہیں وہ خود حرام قرار دے چکے تھے۔ حرمت تصویر کا معاملہ اس کی ایک مثال ہے۔ انہوں نے تصویر کے حرام ہونے کا فتویٰ دیا تھا۔ اگرچہ میں اس کو ناجائز نہیں سمجھتا، لیکن انہوں نے فتویٰ دیا کہ تصویر کھنچوانا حرام ہے لیکن لیڈر بننے کے لیے بلاجھجھک تصویریں کھنچواتے رہے۔

اسی طرح جماعت کے کسی رسالے میں کوئی مضمون نکلتا جس میں قابل اعتراض بات ہوتی اور مجھے توجہ دلائی جاتی تو میں صاحب مضمون کو بلا کر تنبیہ کرتا۔ اگر باہر سے کوئی اطلاع آتی کہ فلاں رکن نے ایسی تقریر کی ہے اور ان خیالات کا اظہار کیا ہے تو میں ان سے بھی بازپرس کرتا۔ اصلاح کے لیے یہی کچھ تھا جو میں کر سکتا تھا۔ بلکہ میری مسلسل تنقید اور اصلاح کی ان کوششوں سے تنگ آ کر مولانا مودودی صاحب کے بعض معتقدین نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ میں شاید رشک و رقابت کی آگ میں جل رہا ہوں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ مجھے زندگی بھر کسی چھوٹی سے چھوٹی ذمہ داری لینے کا شوق بھی نہیں رہا۔ البتہ جو ذمہ داری مجھے سونپ دی جاتی ہے میں پورے احساس ذمہ داری سے اسے ادا کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔

**سوال:** کیا ایسی چیزیں شوریٰ میں بھی زیر بحث آتی تھیں؟

**جواب:** جی ہاں! شوریٰ میں ان پر بحث ہوتی تھی لیکن شوریٰ کی ان چیزوں پر تنقید زیادہ موثر نہیں ہوتی تھی کیونکہ ایسے حضرات کی تحریریں یا تقریریں جب بھی زیر بحث آتیں وہ احتیاط کا وعدہ کر لیتے۔ جب شوریٰ ختم ہوتی تو وہی کچھ دوبارہ ہونے لگتا۔

**سوال:** کیا آپ سمجھتے ہیں کہ جماعت اسلامی اب اقامت دین کی تحریک نہیں رہی؟

**جواب:** اب تو ہر شخص یہ محسوس کر سکتا ہے کہ جماعت اقامت دین کی تحریک تو کجا، ایک عام طرز کی مذہبی جماعت بھی نہیں ہے۔ جس طرح سے نمائش اور پروپیگنڈے کے لیے مذہب کا نام استعمال کیا جاتا ہے اسی طرح یہ جماعت بھی کرتی ہے۔ بلکہ میرے ایک فقرے پر جو میں نے اس زمانے میں مولانا مودودی صاحب کو لکھا تھا، بعض لوگوں کو اعتراض ہوا تھا، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ میں نے صحیح کہا تھا کہ مولانا ہماری

یہی حرکتیں ہیں جن کی وجہ سے لوگ ہمیں مذہبی بہروپئے اور سیاسی چغد سمجھتے ہیں۔ اس جماعت کا دین اور اخلاق جس درجہ برباد ہو چکا ہے اس کا اندازہ اس واقعہ سے لگایئے کہ اس کے قائد نے سالوں تک اخبارات میں اعلان کیا کہ وہ سیرت النبیؐ لکھ رہا ہے اور اس کا امیر صفحات کی قید کے ساتھ اخبارات میں یہ بیان دیتا رہا کہ اتنے صفحات لکھے جا چکے ہیں' چنانچہ اس مقصد کے لیے روپیہ بھی جمع کر لیا گیا۔ لیکن ہوا یہ کہ چند لوگوں نے ان کی کتاب تفہیم القرآن سے سیرت مرتب کر کے سیرت النبیؐ کے نام سے شائع کر دی۔ ظاہر ہے کسی اسلامی جماعت کا قائد ایسا نہیں کر سکتا' صرف کتاب فروش لوگ ہی ایسا کر سکتے ہیں۔

سوال: جماعت سے نکل جانے والوں پر بعض لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ انہوں نے کوئی جماعت کیوں نہیں بنائی؟

جواب: یہ ایک احمقانہ خیال ہے کہ جماعت سے نکل جانے والوں کو ضرور ایک علیحدہ جماعت بنانی چاہیے تھی۔ جماعت بنا دینا اور اس کے نتیجہ میں ایک فتنہ اٹھا کھڑا کرنا کوئی سعادت دارین کمانا نہیں ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جماعت اسلامی کے اس تجربے سے تمام لوگوں کو بڑا تنبہ ہوا کہ جماعت کو صحیح مقصد کے لیے چلانا کس قدر مشکل کام ہے۔ بڑے ہمہمہ اور بڑے نیک ارادوں کے ساتھ یہ کام شروع کیا گیا تھا۔ بڑی اچھی صلاحیتیں بھی جمع ہو گئی تھیں لیکن مولانا مودودی صاحب نے جس طرح کھیل کو بگاڑا وہ آپ کے سامنے ہے۔ اس تجربے کے بعد لوگوں کو اندازہ ہوا کہ ہم ایک شدید غلطی کر بیٹھے تھے۔ چنانچہ اس کے بعد انہوں نے اپنے لیے ایسے مفید کام نکال لیے جن سے پوری امت کو فائدہ پہنچ رہا ہے۔ میں خود یہ محسوس کرتا ہوں کہ میں نے جماعت سے الگ ہونے کے بعد دین کی اور اس امت کی جو خدمت کی ہے وہ میں جماعت میں رہ کر نہیں کر سکتا تھا۔ دوسرے لوگوں کے بارے میں بھی میری رائے یہ ہے کہ انہوں نے بہت سے تعلیمی' مذہبی اور علمی کام کئے ہیں جن سے پوری امت کو فائدہ پہنچ رہا ہے۔

جن لوگوں کو جماعتیں بنانے کا شوق تھا ان کا حال بھی آپ کے سامنے ہے۔ یہ لوگ جماعتیں بناتے ہیں نیک مقاصد کے لیے' لیکن پھر جلد ہی اس فتنے میں پڑ جاتے ہیں کہ وہ جو جتھہ بندی کر چکے ہیں اس کی قیمت وصول کی جائے۔ ہمارے پیش نظر ایسا کوئی مقصد نہیں تھا اس لیے ہم نے اس خطرے کو مول نہیں لینا چاہا۔ اپنی صلاحیتوں کی حد تک ہم نے پوری ملت کی خدمت کی ہے۔ پوری ملت ہماری جماعت ہے' ہم اس کے خادم ہیں۔

سوال: بعض لوگوں کا خیال ہے کہ کسی اسلامی طرز کی اجتماعیت سے وابستہ ہونا' واجبات دینی میں سے ہے۔ آپ کی اس کے بارے میں کیا رائے ہے؟

جواب: یہ بات بالکل غلط ہے۔ پوری امت مسلمہ ہماری جماعت ہے اور اس جماعت کی خدمت کرنا

بقیہ صفحہ 92 پر



زاہد منیر عامر

# صاحب تدبر ـــــــ چند خاطرات

دس بارہ برس پہلے کی بات ہے' تاریخ اور نفسیات کے علوم سے میری دلچسپی بڑھتی جا رہی تھی' مطالعہ کرتے کرتے اچانک ایک روز یہ سوال پیدا ہوا کہ یہ مختلف النوع علوم اور ان کی اہمیت اپنی جگہ مگر خود علم کیا ہے؟؟؟

اپنے پاس موجود کتب سے اس سوال کا جواب پانا چاہا لیکن کامیابی نہ ہوئی رفتہ رفتہ سارے علمی منصوبے رک گئے اور یہ سوال ایک خلش کی سی صورت اختیار کر گیا' ستم یہ ہوا کہ اسی تلاش میں تاریخ فلسفہ کی کسی کتاب میں سوفسطائیہ کے افکار ان کے مختلف مکاتب فکر کی صراحت کے ساتھ دیکھ لئے' اپنے سوال کا جواب تو کیا ملتا ذہن مزید الجھ گیا: حواس خمسہ' حصول علم کے ذرائع ہیں اور پانچوں اعتباری ہیں۔۔۔۔ پھر' علم کیا علم کی حقیقت کیا؟

یگانہ نے تو تشکیک ہی کی تصدیق کی' ہم نے امام رازی کی اسرار التنزیل سے رجوع کیا' اردو دائرۃ المعارف کا علم سے متعلق مفصل مقالہ دیکھا' بعض انگریزی دائرہ ہائے معارف دیکھے لیکن ذہن مطمئن نہیں ہوا۔۔۔ چاہتا تھا کہیں سے سوفسطائیہ کا منطقی جواب ملے۔۔۔۔۔۔

کتابوں سے گزر کر شخصیات سے اس مسئلے پر راہ نمائی کا طالب ہوا' سرگودھا سے لاہور آیا۔ لاہور آ کر میری دوڑ یہاں کی لائبریریوں خصوصاً' پنجاب یونیورسٹی لائبریری' (جو ان دنوں اولڈ کیمپس میں ہوا کرتی تھی) پنجاب پبلک لائبریری اور میوزیم لائبریری تک محدود ہوتی تھی۔۔ پنجاب پبلک لائبریری میں بیٹھتے بیٹھتے اورینٹل سیکشن کے انچارج نصرت علی اثیر صاحب سے دوستی ہو گئی تھی' میں نے اثیر صاحب کے ساتھ مولانا امین احسن اصلاحی صاحب سے ملاقات کا پروگرام بنایا۔ غالباً رسالہ تدبر میں شائع ہونے والے ایک اشتہار سے مولانا کا پتہ دریافت کیا جس کے مطابق ہمیں فاضلیہ کالونی۔ فیروز پور روڈ جانا تھا۔ ہم فیروز پور روڈ پر شاہ جمال اور مسلم ٹاؤن کے درمیان پہنچے اور فاضلیہ کالونی کا پوچھنا شروع کیا۔ خاصی جستجو کے بعد ایک عمارت تک پہنچ سکے جس کے صدر دروازے پر "فاضلیہ" لکھا ہوا ہے (اب جب روزانہ یونیورسٹی اساتذہ کی گاڑی میں یہاں سے گزرتا ہوں تو اس عمارت کو دیکھ کر وہ دن اور ان دنوں کی ساری تگ و دو یاد آ جاتی ہے) یہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ یہ فاضلیہ کالونی نہیں ہے' تاہم اتنا ضرور پتہ چلا کہ مولانا امین احسن صاحب چھاؤنی کے علاقے میں رہتے ہیں اور ہمیں ان کا فون نمبر بھی مل گیا چنانچہ ہم نے 372086 پر فون کیا' غالباً مولانا کے داماد صاحب سے بات ہوئی انہوں نے ہمیں راستہ سمجھایا۔ یوں ہم ڈھونڈتے ڈھانڈتے 19/1 طارق روڈ لاہور چھاؤنی پہنچے۔ بہت شائستگی سے ہمارا استقبال ہوا۔ لان میں رکھی ہوئی

کرسیوں پر بٹھایا گیا۔ کچھ دیر کے بعد اندر سے مولانا امین احسن اصلاحی تشریف لائے۔ نہ خمیدہ کمر، نہ رعشہ نہ آثار ضعف۔ سوائے اس "وقار" کے حضرت ابراہیم نے جس میں افزونی کی دعا کی تھی---- مولانا بالکل تر و تازہ تھے۔ یہ ستمبر 1988ء کا نواں دن تھا۔ ہم نے کوئی دس گیارہ بجے صبح مولانا کی جستجو شروع کی تھی۔ اب ان کے پاس پہنچے تو ظہر کے بعد کا وقت تھا---- مولانا سے مختصر سا تعارف ہوا۔ میں نے ماہیت علم سے متعلق سوفسطائیہ کے نظریے کا ذکر چھیڑا۔ چوتھی پانچویں صدی قبل مسیح میں سوفسطائیہ یونانی فکر پر چھائے ہوئے تھے بلکہ مورخین کے خیال میں تو "یونانی فلسفہ کا مخصوص ارتقاء سوفسطائیہ ہی کی بدولت ثمر آفرین ہوا[1]"۔۔۔۔۔۔ مولانا نے سوفسطائیہ کا ذکر سنا تو بڑے دو ٹوک انداز میں فرمایا:

"سوفسطائیت حماقت کا مترادف ہے۔ اگر ہم نے کسی کو نری حماقت کہنا ہو تو ہم اسے نری سوفسطائیت کہہ دیتے ہیں"۔

جواب بہت واضح تھا لیکن سوفسطائیہ کا استدلال منطقی تھا اور مولانا کا لہجہ جذباتی۔ اگرچہ بعد کے مطالعہ سے مجھ پر مولانا کے جواب کی اصابت منکشف ہوئی لیکن اس وقت سوفسطائیہ کی پیدا کی ہوئی الجھن اتنی کمزور نہ تھی کہ اس طرح محو ہو جاتی۔ سقراط جیسا فلسفی بھی ایک زمانے میں ان کے زیر اثر رہا تھا۔ اگرچہ بعد میں ان کا سخت مخالف ہو گیا۔ جس طرح سقراط، زینو ZENO اور پروٹاگورس PROTAGORAS کا تبع نہیں لیکن ان کے افکار نے سقراطی فکر کے ارتقاء میں حصہ لیا ہے اسی طرح فکری ارتقاء کے سفر میں سوفسطائیہ کی بھی تاریخی اہمیت ہے۔

میری جستجو جاری رہی اور اسی دوران مجھے **کشف المحجوب** میں سوفسطائیہ کے مغالطہ آمیز استدلال کا منطقی جواب ملا۔ اگرچہ اس باب میں صاحب **کشف المحجوب** کا لہجہ بھی بہت تند ہے تاہم ان کی یہ بات اپنے اندر منطق کا بہت زور رکھتی ہے کہ سوفسطائیہ خود اپنی زبانی اثبات علم کر چکے ہیں اس لیے کہ وہ نفی علم کا علم رکھنے کے مدعی ہیں۔ یہ دعویٰ دو صورتوں سے خالی نہیں: نفی کے علم کی صورت یا حصول علم کی دونوں صورتوں میں اثبات علم یقینی ہوا---- اثبات علم ہی کی بحث میں حضرت سید علی ہجویریؒ نے یہ بھی لکھا ہے کہ علم سے علم کی نفی ناممکن ہے اور جب یہ معلوم ہو گیا کہ نفی علم جہل سے ہو سکتی ہے، اور جہل مذموم ہے، چنانچہ جہل کفر خالص اور علامت باطل ہوا جسے حق سے کوئی علاقہ نہیں[2]۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ سقراط نے بھی اسی خیال کا اظہار کیا تھا، اس کے نزدیک بھی جہالت اور گناہ دونوں ہم معنی ہیں۔ اس نے ایک جگہ یہ بھی کہا کہ کوئی شخص گناہ اس لیے نہیں کرتا کہ اسے گناہ سے محبت ہوتی ہے بلکہ وہ گناہ جہالت کی وجہ سے کرتا ہے۔

مولانا امین احسن اصلاحی کے استاد گرامی مولانا حمید الدین فراہی نے ایک جگہ لکھا ہے کہ "(علم باطن



میں) "جاننا" اسی چیز کا نام ہے جس کو "ہونا" کہتے ہیں۔ اچھی اور بری (چیز) کو جاننا اور پھر رغبت و نفرت کا نہ پیدا ہونا، یہ جاننا دین میں مسلم نہیں، حکیم بھی اگر محض نام کا حکیم نہیں تو ایسا ہی سمجھتا ہے۔ سقراط، سرآمد حکمائے یونان کا یہی مذہب تھا اور وہ گناہ اور جہل کو ہم معنی کہتا تھا[3]"۔

بات سوفسطائیہ سے چل کر مولانا اصلاحی کے استاد گرامی اور سقراط پر آ پہنچی ہے۔ اس روز مولانا اصلاحی سے گفتگو میں بھی یہی ہوا، البتہ پہلے سقراط پر بات ہوئی اور پھر مولانا فراہی پر۔

مولانا نے یونانی فلسفے کی تاریخ کے حوالے سے فرمایا کہ آغاز کے تین فلسفیوں کو چھوڑ کر باقی سب فلسفی "یونُنی" ہیں۔ یہ تین فلاسفر سقراط، افلاطون اور ارسطو ہیں۔ ان میں بھی سقراط اصل فلسفی ہے، باقی دونوں اس کے سلسلے سے وابستہ ہیں اور تینوں کے خیالات اسلام سے کامل مطابقت رکھتے ہیں۔ مجھے اس بات سے تعجب ہوا لیکن بعد ازاں سقراط سے متعلق اکثر ماخذ سے یہی معلوم ہوا مثلاً ول ڈیوراں نے THE STORY OF PHILOSOPHY میں بتایا ہے کہ سقراط نہ صرف توحید پرست تھا بلکہ حیات بعد الموت کے عقیدے پر بھی ایمان رکھتا تھا[4]، چند برس قبل "سقراط" کے عنوان سے منصور الحمید صاحب کی کتاب منظر عام پر آئی تو اس میں یہ بحث اور زیادہ وضاحت سے ابھری، یہ کتاب بہت محنت اور سلیقے سے لکھی گئی ہے۔ اگرچہ اس میں بات کچھ بڑھ گئی ہے[5]۔

سقراط کی توحید پرستی کی حد تک تو بات قابل تسلیم ہے لیکن افلاطون اور ارسطو کے حوالے سے اسلامی تعلیمات سے کامل مطابقت کی بات زیادہ قابل فہم نہیں تھی اگرچہ افلاطون اور ارسطو بھی ذات باری تعالیٰ پر تو یقین رکھتے ہیں لیکن ان کے بعض افکار اسلامی تعلیمات سے "کامل مطابقت" نہیں رکھتے۔

بہرحال یہ بات اطمینان بخش ہے کہ 1991 میں جب "فلسفے کے بنیادی مسائل" سے متعلق مولانا کی کتاب شائع ہوئی تو اس میں نہ صرف یہ کہ افلاطون اور ارسطو کے افکار کو اسلامی تعلیمات کے مطابق قرار نہیں دیا گیا بلکہ مولانا نے "افلاطون کے فلسفہ کی غلطی"[8] اور "ارسطو کے فلسفہ کی خامی"[9] کی نشان دہی بھی کی۔

مولانا اصلاحی اپنی زندگی میں جس شخصیت سے سب سے زیادہ متاثر ہوئے وہ ان کے استاد گرامی مولانا حمید الدین فراہی کی شخصیت تھی۔ انہوں نے اپنے استاد گرامی کے طریقہ تعلیم کو "سقراطی طریقہ تعلیم" قرار دیا ہے۔ مولانا کے نزدیک "سقراطی طریقہ تعلیم" کیا ہے اس کی وضاحت انہوں نے اپنے ایک ریڈیو انٹرویو میں کی تھی:

"مولانا کا طریقہ تعلیم ایسا نہیں تھا کہ پکا پکایا سامنے رکھ دیا جائے۔ درحقیقت وہ طالب علم کی استعداد اور ذہانت کو بیدار کرتے تھے، اس کے اندر سوالات پیدا کرتے تھے۔ اگر وہ مسائل پر غور کرنے کی صلاحیت ظاہر کرتا تو وہ کچھ رہنمائی دیتے تھے ورنہ خاموش ہو جاتے۔ یہ "سقراطی طریقہ تعلیم" ہے[10]"۔

مجھے مولانا اصلاحی کا کتب خانہ دیکھنے کا اشتیاق تھا۔ اب جو مولانا سے ملاقات ہوئی اور وہ بہت شفقت و محبت سے پیش آئے تو ہمت کر کے اس اشتیاق کا اظہار کر دیا۔ مولانا نے جواب میں بتایا: میرے پاس تو کوئی کتب خانہ نہیں۔ مجھے کچھ حیرت ہوئی۔ مولانا فرمانے لگے: میرے پاس (ایک مرتبہ پہلے) ایک صاحب آئے تھے انہیں گمان تھا کہ اصلاحی کے پاس تو بہت بڑا کتب خانہ ہو گا۔ میں نے انہیں بتایا کہ دو الماریاں ہیں' جن میں چند کتابیں ہیں اور بس۔ دراصل ہم نے اپنے استاد سے یہ بات سیکھی کہ "کیا پڑھنا ہے"۔ آپ سارا رطب و یابس پڑھنے کی بجائے منتخب چیزیں پڑھیں۔ سب کچھ نہیں پڑھنا چاہیے۔ پھر ایک واقعہ سنایا کہ مجھے ایک صاحب ایک لائبریری میں لے گئے اور بتانے لگے کہ اس لائبریری میں بتیس ہزار (32,000) کتابیں ہیں۔ "میں نے ان سے کہا ان میں پڑھنے کی تو چند ایک ہی ہوں گی"۔

میں نے عرض کیا' لیکن تفسیر لکھتے ہوئے تو آپ کو بہت سی کتب فراہم کرنا پڑی ہوں گی؟ اس کے جواب میں مولانا نے بتایا: تفسیریں اصل میں تین ہیں۔ باقی سب ان تفسیروں کی تفسیریں ہیں۔ (میں نے ان تفسیروں کے نام جاننا چاہے تو مولانا نے فرمایا "اسے چھوڑیں اس سے بحث چھڑ جائے گی") اسی طرح حدیث کی بھی اصل میں دو ہی تین کتابیں ہیں۔ آگے سب تشریح در تشریح ہے۔ میں نے تفسیر لکھتے وقت اصل چیزوں کو پڑھا' باقی کو چھوڑ دیا۔

میرا اگلا سوال ادب کے بحر ناپیدا کنار کی غواصی سے متعلق تھا' اس کے جواب میں مولانا نے بتایا کہ تفسیر لکھنے کے دوران میں جتنی مقدار میں عربی ادب سے واقفیت ضروری تھی وہ تو سارا پڑھا لیکن بعض جاہلی شعراء کا کلام جس کی تفسیر کے لیے ضرورت نہیں تھی چھوڑتا رہا۔ وہ اب پڑھا ہے۔ اب بعض شعراء کو (جن کے مولانا نے اس وقت نام بھی بتائے) مکمل پڑھا ہے لیکن تفسیر کا کام مکمل کر لینے کے بعد"۔

قرآن کریم اور تفسیر قرآن کے تذکرے سے گفتگو مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم کی طرف مڑی۔ میں نے کچھ ہی عرصہ قبل مولانا سندھی کے "افادات و ملفوظات"[11] اور ان کے افکار و خیالات سے متعلق پروفیسر سرور صاحب کی کتاب[12] دیکھی تھی' اس لیے ان سے متعلق بھی بعض باتیں دریافت طلب تھیں' مولانا سندھی اپنے مخصوص زاویہ نظر کے باعث اپنے طبقے کے دوسرے علمائے کرام سے الگ الگ نظر آتے ہیں۔ میں نے ان کے مسلک کی بابت مولانا اصلاحی کی رائے جاننا چاہی تو مولانا نے پورے وثوق سے کہا:

"مولانا عبید اللہ صاحب کا وہی مسلک تھا جو محققین مالکیہ و احناف کا تھا"۔ اس کے بعد گفتگو ذاتی روابط کی طرف چل نکلی۔ مولانا نے بتایا کہ مولانا عبید اللہ صاحب میرے استاد کے قریبی دوست تھے۔ "مجھے اتنا معلوم ہے کہ مولانا عبید اللہ صاحب کا ذکر وہ اپنے بہت محبوب دوستوں میں کرتے تھے"۔ اس لیے میں بھی مولانا عبید اللہ صاحب کا بہت احترام کرتا تھا۔



مولانا سندھی کے سوانح سے واقفیت رکھنے والے اصحاب جانتے ہیں کہ وہ 1915م سے بطریق ہجرت ہندوستان سے غیر حاضر ہو چکے تھے۔ یوں کہ کابل' روس اور ترکی کی جلاوطنی کے بعد اگست 1927[13] میں حجاز چلے گئے جہاں سے وہ مارچ 1939 میں واپس ہندوستان آئے۔

مولانا اصلاحی نے اپنے استاد گرامی کے ساتھ مولانا سندھی کے تعلق پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا کہ جس زمانے میں مولانا سندھی مکہ میں تھے' وہاں سے ہر سال حج کی تکمیل پر ہندوستان آنے والوں کے ہاتھ وہ مولانا فراہی کے لیے تحائف وغیرہ بھیجا کرتے تھے... مولانا نے یہ بھی بتایا کہ "مولانا فراہی کے ساتھ میرا زمانہ تو 1925م سے 1930م تک کا ہے" (اور یہ سارا زمانہ مولانا سندھی کی جلاوطنی کا ہے۔ اس لیے یقینی طور پر مولانا اصلاحی' مولانا سندھی اور مولانا فراہی کی کسی ملاقات کے شاہد نہیں ہو سکتے۔ مولانا سندھی مارچ 1939م میں وطن واپس آئے جبکہ مولانا فراہی نومبر 1930م میں انتقال فرما چکے تھے) تاہم انہوں نے اپنے ساتھ مولانا سندھی کی ملاقاتوں کے احوال بیان کیے اور بتایا کہ مولانا عبید اللہ صاحب میرے ساتھ بہت شفقت فرماتے تھے۔ مولانا فراہی کے بعد جب بھی مدرسۃ الاصلاح سرائے میر آتے تو میرے ہی کمرے میں ٹھہرتے تھے' علمی معاملات میں بہت وسعت رکھتے تھے۔ ایک مرتبہ انہوں نے کوئی مضمون لکھا جس میں حدیث سے متعلق مولانا فراہی کے نقطہ نظر کے حوالے سے کچھ اشتباہ پیدا ہو گیا۔ مجھ سے سید سلیمان ندوی مرحوم نے حقیقت حال واضح کرنے کی فرمائش کی' چنانچہ میں نے سید صاحب کی فرمائش پر معارف اعظم گڑھ میں' "مولانا فراہی اور علم حدیث" کے موضوع پر مضمون لکھا۔ یہ مضمون کوئی 1935-1936 میں شائع ہوا[14]"۔ مولانا عبید اللہ صاحب نے اس مضمون کا مطالعہ بھی کیا اور تذکرہ بھی اور مجھ سے انہوں نے کہا: "مجھے افسوس ہے کہ میرے محبوب دوست کے متعلق میرے مضمون سے غلط فہمی پیدا ہوئی۔ تم نے اچھا کیا جو اسے صاف کر دیا"۔

مولانا نے یہ الفاظ ادا کرنے کے بعد پورے تیقن سے کہا۔ یہ الفاظ مولانا عبید اللہ صاحب کے ہیں۔

یہاں اس بات کا تذکرہ دلچسپی سے خالی نہ ہو گا کہ مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم' مولانا سندھی کے ناقد و مجیب تھے' مولانا سندھی کی کتاب "شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک" اور پروفیسر سرور صاحب کی کتاب "مولانا عبید اللہ سندھی۔ حالات زندگی' تعلیمات' سیاسی افکار" پر مسعود عالم ندوی صاحب کی تنقید انہوں نے ہی معارف میں شائع کی جس کی "تمہید" میں بحیثیت مدیر سید صاحب مرحوم نے لکھا کہ "مولانا سندھی گو بہت سے خیالات میں آزاد ہیں مگر مقلدیت کے باب میں ان کا تشدد علیٰ حالہ قائم ہے[15]"۔ بعد ازاں جب یہ تنقید کتابی صورت میں شائع ہوئی[16] تو اس پر سید صاحب مرحوم نے ایک مفصل مقدمہ بھی لکھا جس میں مولانا سندھی کے تصور وطن کو ہندی عصبیت اور شاہ ولی اللہ صاحب کے حوالے سے ان کے خیالات کو ابہام و اجمال اور اجنبیت کا مظہر قرار دیتے ہوئے کڑی تنقید کی۔

اب ہمیں گفتگو کرتے ہوئے بہت وقت ہو چکا تھا' ابھی عصر کی نماز بھی ادا کرنا تھی۔ چنانچہ میزبان نے نماز کے لیے لان میں جاء نماز بچھائے' وضو کی جگہ کے لیے ہماری راہ نمائی کی--- وضو کے بعد ہم نماز کے لیے اکٹھے ہوئے تو مولانا نے مجھ سے امامت کے لیے کہا لیکن میں جھجکا۔ مولانا نے غیر معمولی طور پر اصرار کیا۔ نماز میں ان کے داماد اور برادرم اثیر صاحب بھی شریک ہو گئے لیکن میرا حجاب اور مولانا کا احترام امر کو ادب پر فوقیت دینے میں حائل ہی رہے۔

نماز کے بعد ہم مولانا سے کسی نصیحت کے خواہاں ہوئے۔ مولانا' انتخاب سے پڑھنے کی اہمیت پہلے واضح کر چکے تھے' اب انہوں نے انتخاب سے لکھنے کی ضرورت پر زور دیا اور اس میں بھی سند اپنے استاد سے لائے' فرمانے لگے: مولانا فراہی بہت زیادہ لکھنے کو دوسروں کا وقت ضائع کرنے سے تعبیر کرتے تھے اور کہا کرتے تھے: "ہمیں کسی کا وقت ضائع کرنے کا کوئی حق نہیں"۔ میں یہ کہتا ہوں کہ "یونہی کاغذ سیاہ کرنے سے کیا فائدہ--؟" انسان کو بہت سوچ سمجھ کر اور انتخاب سے لکھنا چاہیے اور کوشش کرنی چاہیے کہ ہمیشہ طالب علم کی زندگی گزارے۔ ہمیشہ طالب علم رہو' طالب علم رہنے سے ہی کچھ حاصل ہوتا ہے' سب سے اچھی حیثیت طالب علم کی ہے۔ مولانا فراہی اپنی کتب پر "المعلم فراہی" لکھتے تھے' میں نے اپنی کتب پر ہمیشہ "المتعلم اصلاحی" لکھا۔

طالب علم رہنے کی ضرورت پر مزید زور دیتے ہوئے فرمانے لگے: آج کل علم کم یاب ہو گیا ہے۔ لوگوں کی تحریریں پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے کچھ نہیں پڑھا۔ سطحی سی معلومات ہیں۔ مختلف مسالک کے لوگ اپنے مسلک کے ایک دو نام ور علما کی کتابیں پڑھ لیتے ہیں اور بس--- فتاوی کی کتابیں چھپ گئی ہیں۔ انہی سے سارا دین سمجھ لیا جاتا ہے۔ اللہ اللہ خیر صلا' اخبارات انہی کو علامہ بنا دیتے ہیں--- دین کی صحیح فہم براہ راست حاصل نہیں کرتے۔

اب مزید بہت سا وقت گزر چکا تھا۔ مغرب کے وقت میں زیادہ دیر نہیں رہ گئی تھی۔ چنانچہ ہم مولانا سے اجازت کے خواستگار ہوئے اور اذان مغرب سے کچھ ہی پہلے مولانا کے ہاں سے رخصت ہوئے---- یہ مولانا سے میری پہلی ملاقات تھی۔ اس کے بعد مزید کچھ دن لاہور رہا اور اپنے تحقیقی منصوبوں پر کام کرتا رہا۔ بعض اور اصحاب سے بھی ملاقاتیں ہوئیں اور بالآخر میں سرگودھا واپس چلا گیا۔

اس کے ایک برس بعد 1989ء میں ایم اے کے سلسلہ میں پنجاب یونیورسٹی سے وابستگی کے لیے لاہور آ گیا--- لاہور آ کر حالی پر دنیا کے "دار المحن" ہونے کی حقیقت منکشف ہوئی تھی اور میرا جی نے اس ڈھول کو دور سے سننے کی تلقین کی تھی لیکن میں نے یہاں آ کر اس شہر کی کشش اور مجید صاحب* کے بقول برکت کو محسوس کیا اور دیکھا کہ لاہور اپنے وابستگان دامن کے گلے میں جو زنجیر حائل کرتا ہے اس کی گرفت بڑھتی ہی چلی جاتی ہے۔ یہاں جس رفتار سے مواقع بڑھتے ہیں' وقت اسی رفتار سے گھٹتا جاتا ہے۔



دس برس قبل لاہور نے جو حلقہ ڈالا تھا وہ آج بھی زیب گلو ہے۔ ان دس سالوں میں اگرچہ ملازمتوں کے سلسلہ میں دو مرتبہ لاہور چھوٹا لیکن اس "بابرکت شہر" کی کشش پھر ہمیں کھینچ لائی۔

۱۹۸۹ء میں جب میں لاہور آیا تو انارکلی میں مقیم ہوا۔ یہاں قیام کے زمانے میں ہی مئی ۱۹۹۰ء میں میرا پیارا دوست محمد تاثیر (جسے مرحوم لکھنے کو دل نہیں چاہتا لیکن وہ ۴ دسمبر ۱۹۹۶ء کو اس خاک داں سے رخصت ہو گیا) مجھے ملنے کے لیے 222۔ لاء کالج ہاسٹل آیا۔ وہ ان دنوں غالباً مسئلہ ارتقاء پر کچھ پڑھ رہا تھا' مولانا اصلاحی نے سورۃ الدھر کی پہلی آیت

**هل اتى على الانسان حين من الدهر لم يكن شيئا مذكورا○**

"کیا گزرا ہے انسان پر کوئی وقت' زمانے میں' ایسا جب وہ کوئی قابل ذکر چیز نہ تھا[۱۷]" کی تفسیر میں لکھا ہے کہ

"ایک وقت انسان پر ایسا بھی گزرا ہے جب اس کا وجود کوئی قابل ذکر چیز نہیں تھا بلکہ وہ پانی' کیچڑ' مٹی کے اندر رینگنے والی ایک حقیر مخلوق تھا لیکن اسی حقیر مخلوق کو قدرت نے مختلف مراحل سے گزارا اور اس کی صلاحیتوں کو تربیت دے کر ایسے مرتبہ پر پہنچا دیا کہ وہ تمام مخلوقات سے اعلیٰ و اشرف بن گیا[۱۸]"۔

"پانی' کیچڑ' مٹی کے اندر رینگنے والی حقیر مخلوق" کے الفاظ سے ذہن بقائے اصلح (Survival of the fittest) کے تصور کی طرف جاتا ہے۔ چنانچہ یہ خیال ہوا کہ مولانا سے مل کر ارتقاء اور بقائے اصلح کے نظریات سے متعلق ان کا نقطہ نظر تفصیل سے معلوم کیا جائے۔ میں نے مولانا سے ملاقات کا وقت لینے کے لیے طارق روڈ والی رہائش پر فون کیا لیکن وہاں سے معلوم ہوا کہ مولانا یہاں سے جا چکے ہیں--- کہاں؟--- ڈیفنس میں!--- وہاں کا فون نمبر لینا چاہا تو صاحب خانہ کے حسن خلق کے باعث کسی دشواری کے بغیر مل گیا۔ چنانچہ اس نئے فون نمبر پر رابطہ کیا۔ ملاقات طے ہوئی' ایڈریس دریافت کیا اور ہم دونوں مقررہ وقت سے کوئی گھنٹہ بھر پہلے لاء کالج ہاسٹل سے روانہ ہوئے۔ میں نے مولانا کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے اپنی کتاب "لمحوں کا قرض" کا ایک نسخہ ساتھ لیا' تاثیر بھی وضعدار تھا اس نے مال روڈ سے گزرتے ہوئے مجھے روکا اور پینوراما کے قریب کاسمیٹکس کی ایک دوکان سے مولانا کے لیے پرفیوم خریدا' یوں ہم دونوں اپنے اپنے "ہدایا" کے ساتھ مولانا کی خدمت میں ۹/ وی ڈیفنس ہاؤسنگ سوسائٹی پہنچے۔ حسب سابق مولانا کے صاحب زادے' ابو سعید اصلاحی صاحب نے بہت حسن خلق کے ساتھ استقبال کیا اور ہمیں اپنے شاندار گھر کے وسیع اور خوب صورت لان میں رکھی ہوئی کرسیوں پر بٹھایا۔ کچھ دیر کے بعد مولانا باہر تشریف لائے۔ وہی وقار' شان اور تمکنت جو ڈیڑھ برس قبل دیکھی تھی اب بھی مولانا کے چہرے سے نمایاں تھی۔ یہ ۱۷/ مئی ۱۹۹۰ء کی ایک کم گرم شام تھی۔ مولانا کی رہائش گاہ کا نظر افروز لان اور ڈیفنس کی کشادہ فضا موسم کو خوشگوار بنائے ہوئے تھی۔ مولانا اس وقت عمر کی ۸۶ ویں حد عبور کر چکے تھے

لیکن ان کا چہرہ تر و تازہ تھا' یادداشت محفوظ' ذہن براق۔ ثقل سماعت کے سوا' یوں لگتا تھا پیری ان سے کچھ بھی نہیں چھین سکی ہے۔ مولانا بہت شفقت سے ملے۔ صاحب خانہ نے میرا تعارف کروایا "یہ پہلے بھی ایک بار تشریف لائے تھے اور ساتھ ان کے دوست ہیں جو سرگودھا سے آئے ہیں"۔ مولانا جواب میں مسکرائے' ہم نے اپنے اپنے تحفے مولانا کو پیش کیے جو قبول ہوئے اور اسی دوران میں سلسلہ گفتگو کا آغاز ہوا' ہم نے مسئلہ ارتقاء سے متعلق استفسار کیا۔ مولانا نے بہت استحضار کے ساتھ لب کشائی کی۔ میرے پاس دو تین سادہ کاغذ تھے میں نے مولانا کی گفتگو کو لکھنا شروع کر دیا۔ وہ سادہ کاغذ ختم ہو گئے تو خاکستری رنگ کا وہ لفافہ جس میں پرفیوم لایا گیا تھا' کام آیا' اس لفافے پر لکھی ہوئی یادداشت آج بھی میری ڈائری میں لفافے سمیت محفوظ ہے' مولانا نے فرمایا:

"کائنات ارتقاء ہی کے ذریعے سے وجود پذیر ہوئی ہے۔ ارتقاء بجائے خود صحیح ہے لیکن ڈارون کی توجیہہ غلط ہے۔

انسان پہلے کیچڑ ہی میں تھا۔ ایک خاص فارم سے اس نے ترقی کی' ارتقاء ہوتے ہوتے وہ اس فارم میں آیا کہ وہ ایک انسان بن سکے۔ اللہ نے ارادہ کیا اور اس چیز (فارم) سے آدم وجود میں آئے اور ان کا جوڑا پیدا کیا گیا۔ سائنس والے مانتے ہیں کہ حقیقت میں ایک ہی چیز تھی جس میں نر اور مادہ دونوں کے جراثیم موجود تھے۔ لیکن یہ سب ایک مدبر' حکیم اور خبیر نے کیا۔۔۔۔ آخر اس کی کیا توجیہہ ہے کہ کیونکر ایک چیز بنتی چلی گئی۔ آپ سے آپ تو کچھ بھی نہیں ہوتا' ایک درخت کی شاخ بھی ایک خاص سکیم کے تحت ظاہر ہوتی ہے۔ ڈارون کی تقریر پر ہمیں اعتراض ہے۔ اس میں جگہ جگہ معقولیت نہیں ہے۔ (تاہم) جب ارتقائے آدم ہو گیا اور جب آدم وجود میں آ گئے تو نسل انسانی وجود پذیر ہو گئی۔ اب وہ پہلا دور ختم ہو گیا ایک فٹسٹ (Fittest) جب وجود میں آ جائے تو دوسری چیز اس میں مداخلت نہیں کرتی Survival of the Fittest (بقائے اصلح) کا یہی مطلب ہے کہ جب ایک Fittest وجود میں آ جائے تو اپنے راستے پر چلے گا۔

ہم ارتقاء کے اصول کے بقائے اصلح Survival of the Fittest کے قائل ہیں"[19]۔ یہ اصول ہے لیکن ڈارون کی توجیہہ نہایت احمقانہ ہے۔ وہ ایک مصنف ہے۔ ایک تقریر کرنے والا ہے۔ اسے زیادہ اہمیت نہ دی جائے"[20]۔

یہاں قرآن مجید کی سورہ ق[21] اور بعض دوسرے مقامات اور بائبل / کتاب پیدائش کے حوالے سے سوال پیدا ہوا کہ ان مقامات پر تخلیق کائنات کا عمل چھ دن میں مکمل ہوتا بتایا گیا ہے۔ اگر بقائے اصلح کا تصور درست ہے۔ تو پھر ان دونوں باتوں میں تطبیق کیسے ہو سکتی ہے۔۔۔؟ مولانا نے اس کے جواب میں فرمایا

"قرآن کی تعبیر اور بائبل کی تعبیر میں دنوں سے ادوار مراد ہیں اور ادوار ہر عالم میں الگ الگ ہیں اور اللہ کے دن ہمارے سالوں کے حساب سے اتنے بڑے ہیں کہ ہزاروں کا حساب بھی لگائیں تو کم پڑ جائے۔



نظام کائنات میں جس (دنیا) میں انسان رہتے ہیں (یہ) لانہایت وسعت میں ایک ذرے کی حیثیت (رکھتی) ہے۔ اس کے نظام میں خداوند تعالیٰ کے معاملات ایک ہزار سال کے حساب سے آتے ہیں' نجانے اس میں بھی کتنے ہی ثوابت ہیں' کتنے ہی چاند ہیں' سیارے ہیں۔ الگ الگ نظام ہیں۔ اگر (انہیں) اپنے دنوں کے لحاظ سے ناپیں تو (سب کچھ) بہت چھوٹا ہو گا۔ ادوار بھی مختلف درجے کے ہوں گے' الگ الگ ہوں گے"[22]۔

اس کے بعد گفتگو اسلام میں حلت و حرمت کے اصول سے متعلق قریش اور یہود کے اس اعتراض پر ہوئی جس میں انہوں نے کہا تھا کہ اہل اسلام دعوی تو ملت ابراہیمی سے تطابق کا کرتے ہیں لیکن انہوں نے حلت و حرمت کے اصول ملت ابراہیمی سے جدا بنا رکھے ہیں۔

مولانا نے اس موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے کہا:

"قریش نے اپنے جی سے چیزیں حرام کر رکھی تھیں۔ ان کی اس حرمت کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ ملت ابراہیمی میں تو صرف یہ یہ جانور حرام ہیں' باقی تم نے خود کیے ہیں۔ جہاں تک ایسے جانداروں کی حرمت کا تعلق ہے جن پر اعتراض کیا جاتا تھا ان میں درندے پرندے کی حرمت فطرت پر مبنی ہے۔ چند چیزوں کا تعلق عقائد و روایات سے ہے۔ باقی چیزیں وہ ہیں جن سے فطری طور پر انقباض یا نفرت محسوس ہوتی ہے۔ بعض چیزیں شرک کی بناء پر حرام ہیں۔ ان میں شرک کا شائبہ ہے۔ مثلاً غیر مسلم کا ذبیحہ۔ بعض چیزوں میں نجاست ہے' بعض صحت کے لیے مضر ہیں۔ گھوڑے' گدھے کی حرمت بھی طبعی کراہت کے باعث ہے۔

قرآن نے بنیادی باتیں بیان کر دی ہیں۔ میت کا لفظ آیا ہے۔ یہ مجمل ہے۔ اس کی کئی شکلیں ہو سکتی ہیں۔ تعداد' اصول کی روشنی میں دیکھا جائے تو اتنی ہی نکلے گی جتنی کہ ملت ابراہیمی میں تھی۔ اور پھر یہ کہ پہلے صحائف میں یہ بتایا گیا تھا کہ آخری نبیؐ طیب اور خبیث چیزوں سے متعلق خدا کے احکام سے آگاہ کریں گے اور لوگوں کو ان جکڑ بندیوں سے آزاد کریں گے جو انہوں نے خود اپنے اوپر عائد کر رکھی ہیں' چنانچہ یہ وضاحت فرما دی گئی اور اس کے بعد یہ اجازت بھی مل گئی کہ اب تم اہل کتاب کا ذبیحہ بھی کھا سکتے ہو۔ اب تمہارے لیے چیزیں جائز کر دی گئی ہیں۔ تمہارے متعلق خبیث سے آلودہ ہونے کا اندیشہ نہیں[23] رہا"۔

اس کے بعد بھی گفتگو جاری تھی اور مولانا اپنے انداز خاص میں محو کلام تھے کہ ان کے صاحب زادہ صاحب نے بہت سلیقے سے میرے کان میں کہا کہ ڈاکٹروں نے مولانا کو زیادہ گفتگو سے منع کر رکھا ہے۔

چنانچہ اس کے بعد ہم دونوں نے اجازت لی اور اپنے مستقر کی طرف روانہ ہوئے۔

اس ملاقات کے بعد 1991ء میں جب محترم ڈاکٹر خورشید رضوی صاحب اسلام آباد سے لاہور آ گئے تو ایک روز میں انھیں مولانا سے ملوانے کے لیے لے گیا۔ پہلے تو ہم کچھ دیر لان میں بیٹھے رہے اس کے بعد غالباً مولانا کی صحت کے پیش نظر ہمیں اندر لے جایا گیا۔ اب ہم لاؤنج سے گزر کر جس کمرے میں آئے وہ غالباً مولانا ہی کا بیڈ روم تھا۔ سلیقے اور نفاست سے رکھی ہوئی اشیاء' صاف ستھرا ماحول اور اس میں اجلے اجلے مولانا امین احسن صاحب کا سراپا' قریب روایتی بزرگوں کی طرح پان کے اسباب دھرے ہوئے' وہ نقش اب بھی آنکھوں کے سامنے ہے۔ اس ملاقات میں زیادہ گفتگو ڈاکٹر خورشید رضوی صاحب نے کی' میں سامع بنا رہا۔ خورشید صاحب نے مولانا کے تفردات کے حوالے سے' ان کی ایک منفرد رائے کے بارے میں سوال کیا کہ مولانا کیا آپ سے قبل بھی یہ بات کسی نے کی ہے؟

مولانا مسکرائے اور کہنے لگے:

"اگر مجھ سے پہلے بھی کسی نے یہ بات کی ہوتی تو اللہ تعالیٰ مجھے کیوں پیدا کرتا۔؟"

مولانا کی گراں گوشی خاصی بڑھ چکی تھی اس لیے یہ ملاقات زیادہ دیر تک جاری نہ رہ سکی۔

۲۱/ اکتوبر ۱۹۹۳ء کو میں ایچی سن کالج لاہور سے استاد شعبہ اردو کی حیثیت سے وابستہ ہوا' جلد ہی مجھے کالج کی ادبی و ہم نصابی سرگرمیوں کا انچارج بنا دیا گیا۔ ان ذمہ داریوں میں ایک کالج میگزین "ایچی سونین" کی ادارت کی بھی تھی۔ میں نے سٹاف ایڈیٹر کی حیثیت سے ملک کے ارباب علم و فضل سے ان کی زندگی کے حاصل کے بارے میں استفسار کا پروگرام بنایا۔ اس سلسلہ میں مولانا اصلاحی سے بھی ملاقات طے ہوئی چنانچہ ۷/ جولائی ۱۹۹۴ء کو میں "ایچی سونین" کے طالب علم مدیران "" کو ہمراہ لے کر مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اب مولانا کی کیفیت پہلے جیسی نہیں تھی' ان کی سماعت قریب قریب ختم ہو چکی تھی۔ یادداشت بھی' جس سے میں پہلی ملاقاتوں میں بہت متاثر ہوا تھا' اب پہلے سے کمزور پڑ چکی تھی۔ گفتگو دشوار ہو گئی تھی اس لیے کہ ہمیں اپنی بات مولانا تک پہنچانے کے لیے سلیٹ پر لکھنا پڑتا تھا' وہ بھی جلی حروف میں۔ مولانا اسے پڑھ کر جواب دیتے' پھر پہلی بات کو مٹا کر دوبارہ سوال لکھا جاتا۔ اس طرح ظاہر ہے گفتگو میں وہ لطف نہیں ہوتا جو مکالمہ زبانی میں ہوا کرتا ہے۔ بہرحال ہم نے "ایچی سونین" کا تعارف کروایا اور اب جس طرح گفتگو ممکن رہ گئی تھی اسی طرح ان سے ایک طویل مکالمہ کیا:

میں نے سلیٹ پر سوال لکھا:

"آپ کے افسانہ حیات کا مرکزی خیال کیا ہے؟"

مولانا نے غور سے [illegible] کو پڑھا اور ---- گویا ہوئے۔

"میں کچھ نہیں [illegible] سکتا کہ اس کے متعلق میری کیا رائے ہے۔۔ میرا افسانہ حیات کوئی نہیں۔ میں



صرف سیدھا سادا مسلمان آدمی ہوں اور میرا نقطہ نظر خالص قرآن رہا ہے۔ قرآن کو 'سمجھنا' سمجھانا۔ اور یہ بات بھی ہے کہ اس کے لیے طریقہ بھی مولانا فراہی کا' جو ہندوستان کے ایک بڑے فاضل پروفیسر گزرے ہیں۔ (مولانا نے پروفیسر کا لفظ غالباً میرے شعبے کی رعایت سے استعمال کیا)۔ ان کے طریقے پر قرآن کریم پر غور کرنا میرا کام رہا ہے' میں نے زندگی بھر یہی کام کیا ہے اور انہی اصولوں کے مطابق تفسیر تدبر قرآن لکھی ہے۔ میں نے اس میں یہ ثابت کیا ہے کہ مولانا کا جو طریقہ فکر ہے وہی نیچرل ہے"۔

میرے اس سوال پر کہ آپ کو زندگی کیسی لگی' مولانا نے فرمایا:

"میری اپنی زندگی کچھ نہیں ہے۔ میری اپنی زندگی تابع ہے قرآن کے' یعنی میری زندگی میں بامقصد نصب العین جو کچھ ہے وہ صرف یہ ہے کہ قرآن کے مطابق عقلی' اخلاقی' سیاسی' اجتماعی (پہلوؤں سے) زندگی گزاری جائے' میں ہر چیز اجتماعی' سیاسی' اخلاقی' عقلی میں یہ کوشش کرتا ہوں کہ اس کی پیروی کروں"۔

راقم: آپ نے اپنی جوانی اور بڑھاپے کی زندگی میں کیا فرق محسوس کیا؟

مولانا: "میری جوانی کی زندگی کہہ لیجے اور اب بڑھاپے کی زندگی ایک ہی طرح کی ہیں' میرا فکر ہے قرآن' قرآن کے فکر کے مطابق میری اجتماعی اخلاقی' اصلاحی سیاسی زندگی ہے"۔

راقم: کیا آپ سمجھتے ہیں کہ زمانے نے آپ کو سمجھ لیا؟

مولانا: میرا اپنا زندگی میں کوئی خاص اسلوب' کوئی خاص فلسفہ نہیں' اگر میری زندگی کا کوئی فلسفہ ہے تو وہ قرآن ہے۔ اگر کوئی قرآن کو سمجھتا ہے تو اس کے لیے آسان ہے کہ وہ میری زندگی کو بھی سمجھ سکتا ہے' اور اب (اس سلسلہ میں زیادہ) بتانے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ بتانے کی کتاب تو میں نے لکھ دی ہے۔۔ تدبر قرآن۔۔ اس کا مقصد یہی ہے کہ لوگ قرآن کو سمجھ جائیں اور ممکن ہے (اس طرح) مجھے بھی سمجھ جائیں۔

راقم: مولانا' آپ زمانے سے جو کچھ کہنا چاہتے تھے' آپ کا کیا خیال ہے' آپ نے وہ سب کچھ کہا' آپ کا پیغام زمانے تک پہنچ گیا؟

مولانا: میرا خیال یہ ہے کہ اس معاملے میں نقطۂ نظر مختلف ہو سکتے ہیں' اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک شخص کے خیالات کے حدود کو صحیح طریقے پر ہر شخص متعین نہیں کر سکتا۔

یہ واقعی ہے کہ "قرآن سے میرا جو تعلق ہے اس کا عملی اطلاق میری اپنی زندگی پر ہوتا تھا (میرے لیے ضروری تھا کہ) میں اپنی زندگی کو اسی سانچے میں ڈھالوں اور باقی رہ گیا دوسروں کے لیے کوشش کرنا تو یہ (بھی) میرا کام ہے۔ لیکن میں اس کے متعلق تو فیصلہ نہیں کر سکتا کہ (اس میں مجھے) کتنی کامیابی رہی۔

راقم: مولانا کیا آپ اپنی زندگی سے مطمئن ہیں؟

مولانا: میں ذاتی طور پر بالکل مطمئن ہوں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ میں جو نقطہ نظر رکھتا ہوں یہی ہے کہ لوگوں تک اپنے خیالات و افکار کو پہنچا دینا میرا کام ہے۔ (لوگوں کے) افکار کو تبدیل کرنا میرا کام نہیں ہے۔

مجھے معلوم ہے کہ جہاں تک میری زندگی کا تعلق ہے میں ایک دفعہ بھی اس سے (قرآن سے) الگ نہیں رہ سکا۔ اور میں نے (زندگی بھر) یہی کیا ہے کہ قرآن ہر شخص تک پہنچاؤں۔ قرآن کیا چاہتا ہے۔ اس کا نصب العین کیا ہے' اجتماعی (اور) سیاسی زندگی میں (اس کی) کیوں ضرورت ہے تو (یہ سب) بتایا ہے (یہ باتیں) میں سب کو بتاتا ہوں' شاگردوں کو بھی اور جو میرے افکار کو پڑھتے ہیں ان کو بھی (اسی مقصد کے لیے میں نے) درجنوں کتابیں لکھی ہیں۔

اس لیے میرا کام تو بالکل ٹھیک ہو رہا ہے۔ مجھے کوئی افسوس نہیں ہے۔ میرا کام صرف بتانے کی کوشش کرنا ہے۔ آپ کو پڑھا دینا میرا کام نہیں ہے۔ بتا دینا میرا کام ہے۔ یہی کر سکتا ہوں۔

لوگ زندگی کے متعلق (دنیوی حوالوں سے) بہت بڑا نصب العین قائم کر لیتے ہیں' تو پریشانیوں میں مبتلا ہوتے ہیں۔ میں اپنی زندگی کا (یہ) نصب العین رکھتا ہوں کہ پہنچا دو کہ صحیح بات کیا ہے؟ اس سے میں نے قرآن کو سمجھا اور سمجھانے کی کوشش کی' زندگی بھر پڑھاتا رہا ہوں' تفسیر لکھی ہے اور اس کو ثابت کرنے کے لیے نجانے کتنی کتابیں لکھ ڈالی ہیں۔ شاید آپ نے دیکھا ہو یہ کتابیں انہی موضوعات پر ہیں۔ اور یہ بات بھی ہے کہ کتابیں پھیل رہی ہیں۔ تفسیر بھی پھیل رہی ہے۔

راقم: کوئی ایسی بات' کوئی ایسا کام جسے انجام دینا آپ کی خواہش رہی ہو لیکن وہ انجام پذیر نہ ہو سکا ہو؟

مولانا: مجھے یہ افسوس نہیں ہے کہ کوئی ایسا پہلو جس میں مزید کام کرنا چاہیے تھا (رہ گیا) میں نے "اللہ کا شکر ہے کہ اپنے استاد کی رہنمائی میں پہلے زندگی کا نصب العین جانا اور پھر اس پر زندگی بھر قائم رہا۔ اور یہ بات بھی ہے کہ وہ ایسا نصب العین تھا جس نصب العین میں ریا کا کوئی سوال نہیں تھا۔ میں (الحمد للہ) اپنے دائرے میں بالکل صحیح اور موثر ہوں"۔

مولانا کی یہ ساری گفتگو ہم نے ٹیپ ریکارڈر پر محفوظ کر لی اور انہی دنوں اسے ٹیپ سے کاغذ پر منتقل کر لیا گیا' "اپنی سونین" کا وہ شمارہ تو بوجوہ شائع نہ ہو سکا جس کے لیے یہ انٹرویو ریکارڈ کیا گیا تھا البتہ مولانا کی گفتگو کا مسودہ میں نے اپنے پاس محفوظ رکھا اور اب پہلی بار یہ یادگار گفتگو شائع ہو رہی ہے۔ اس میں الفاظ بھی مولانا کے ہیں البتہ توسین کے اضافے میری طرف سے ہیں۔

مولانا کے ساتھ میری یہ گفتگو آخری ثابت ہوئی اور ملاقات بھی۔ اس کے بعد میں کبھی مولانا کی خدمت میں حاضر نہ ہو سکا۔ یہاں وہاں سے ان کی صحت کی خرابی کی خبریں ملتی رہیں یہاں تک کہ ۱۵ دسمبر



۱۹۹۷ء کی رات کو ٹیلی وژن کے خبرنامے سے مولانا کے انتقال کی خبریں ملی کہ انہیں سپرد خاک بھی کیا جا چکا تھا---- انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مولانا مرحوم کی زندگی کے بعض واقعات بہت عجیب اور نصیحت افروز ہیں۔ اوائل عمر میں مولانا فراہی کا خود ان سے یہ کہنا کہ آپ صحافت ہی کریں گے یا ہم سے قرآن پڑھیں گے اور مولانا کا صحافت چھوڑ کر قرآن پڑھنے کا فیصلہ کرنا۔

جنوری ۱۹۵۸ء میں اپنی زندگی کے ایک بڑے حصے کی مساعی کو اصولی اختلاف کی بناء پر DISOWN کر دینا۔

۱۹۶۵ء میں جواں سال اور ذہین و فطین صاحبزادے ابو صالح اصلاحی کے انتقال کا حادثہ اور ساری ذمہ داریوں کا بار مولانا پر آ رہنا۔

۱۹۷۱ء میں ذہنی کام کی زیادتی کے باعث مولانا کی شدید علالت۔ "یادداشت اور شناخت کا محو ہو جانا" اس کے بعد صحت کا بحال ہو جانا اور پھر تفسیر لکھنا۔

۱۹۷۲ء میں معاشی حالات سے مجبور ہو کر لاہور کو چھوڑنا اور شیخوپورہ کے ایک گاؤں میں چلے جانا' وہاں کھیتی باڑی کی مصروفیت' قرینے کے کسی مکان کا نہ ہونا' بجلی اور دیگر سہولیات زندگی کے بغیر' درختوں کے نیچے بیٹھ کر چڑیوں' بھڑوں اور مکھیوں کے نرغے میں تفسیر جیسا عظیم الشان کام انجام دینا[۳۳]۔

یہ سب بہت عجیب اور مولانا کی ہمت' لگن اور عظمت کا ثبوت فراہم کرنے والے حقائق ہیں۔ مولانا کی زندگی ان کٹھنائیوں سے گزر کر بڑھاپے کی اس منزل میں پہنچی تھی جسے ہم نے دیکھا۔ مولانا نے تدبر قرآن کی آخری جلد کے ابتدائیے میں لکھا تھا کہ "مجھے پورا یقین ہے کہ جس رب کریم نے بچپن میں پالا۔ جوانی میں کھلایا' پہنایا وہ بڑھاپے میں بھی بھوکا ننگا نہیں رکھے گا بس یہ یقین میرا اصل سرمایہ ہے"[۳۶]

بلاشبہ رب کریم محسنین کے اجر کو ضائع نہیں کرتا' ہم نے مولانا کا بڑھاپا دیکھا۔ مشقت اور ریاضت کی جوانی کے بعد اللہ نے مولانا کو ایک قابل رشک بڑھاپا عطا کیا۔ مولانا اپنی آخری عمر میں جس گھر اور ماحول میں رہتے تھے اس میں انہیں شاید ہی کسی چیز کی کمی ہو---- بعض صورتوں میں یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ خارجی سطح پر تو زندگی تمام آسائشوں سے مرصع ہوتی ہے لیکن اہل خانہ مولانا ایسے بزرگوں کے کام اور مقام سے ناواقف ہوتے ہیں۔ مولانا اصلاحی اس پہلو سے بھی منفرد حیثیت کے مالک تھے۔ جہاں تک ہم نے دیکھا ان کے اہل خانہ کے رویوں میں مولانا کے دیگر عقیدت مندوں سے بڑھ کر عقیدت اور محبت جھلکتی تھی۔ یہ وہ نعمت ہے جو بڑے لوگوں میں سے کم کم کے حصے میں آتی ہے---- دعا ہے کہ رب کریم مولانا کی ہر نوعی لغزشوں سے درگزر کرتے ہوئے انہیں آخرت کی منزلوں میں اس سے بھی بڑھ کر اعزاز و اکرام عطا فرمائے۔ آمین۔

مولانا اصلاحی رخصت ہو گئے لیکن ان کی تفسیر انہیں زندہ رکھے گی۔

نرفتہ اند حریفاں کہ تا سخن باقیست
زدیدہ رفتہ و در دل ہنوز جا دارند

# حواشی

۱۔ ول ڈیوراں نے لکھا ہے:

But the most characteristic and fertile development of Greek Philosophy took form with the sophists.
WILL DURANT : The Story of Philosophy
New York : Simon and Schuster 1953 p.6.

۲۔ حضرت سید علی ہجویری کے الفاظ ہیں:
"بایشان گوئیم کہ: ایں دانش کہ می دانید کہ: "بہ ہیچ چیز علم درست نیاید" درست ہست یانی؟ اگر گوئید: "ہست" علم اثبات کردید۔ واگر گوئید "نیست" پس چیزی کہ درست نیاید، آنرا معارضہ کردن محال باشد، وبا آن کس سخن گفتن از خرد نبود"
اسی فصل میں "گروہی از ملاحدہ" کے زیر عنوان لکھا ہے:
"علم مر علم را نفی نکند وضد نیاید، وبہ علم ترک علم محال باشد۔ ماند اینجا جہل۔ وچون درست شد کہ نفی علم جہل باشد و ترک آن بہ جہل بود و جاہل مذموم باشد وجہل قرینہ کفر، باطل باشد کہ حق را بہ جہل تعلق بود"
سید علی بن عثمان ہجویری، ابوالحسن: کشف المحجوب، بکوشش دکتر محمد حسین تسبیحی رہا
اسلام آباد: مرکز تحقیقات فارسی ایران وپاکستان: ۱۹۹۵ء ص ۱۹، ۲۰

۳۔ محمد عنایت اللہ سبحانی: "مولانا حمید الدین فراہی" لاہور: البدر پبلی کیشنز جنوری ۱۹۸۰ء، ص ۳۳۳

۴۔

"He had his own religious faith: he believed in one God, and hoped in his modest way that death would not quite destroy him". (OP--CIT, P.10)

۵۔ شائع کردہ دار التذکیر لاہور (ستمبر ۱۹۹۴ء)۔

6. "PLATO believes that a nation cannot be strong unless it believes in God. (OP --CIT, P. 24)

7. Please see the note "Metaphysics and the nature of God" in chapter II Aristotle and Greek science, The Story of Philosophy P. 56

۸۔ امین احسن اصلاحی: فلسفے کے بنیادی مسائل۔ قرآن حکیم کی روشنی میں (ترتیب: محبوب سبحانی، خالد مسعود) لاہور: فاران فاؤنڈیشن ۱۹۹۱ء ص ۱۹۳

۹۔ محولہ بالا ص ۱۹۸

۱۰۔ منظور الحسن (مرتب) مولانا اصلاحی سے ایک یادگار انٹرویو، انٹرویوور: مصباح الدین اصلاحی۔ ریڈیو پاکستان لاہور ۲۳/ مارچ ۱۹۸۴ء مطبوعہ ماہنامہ اشراق ج ۱۰ ش ۲، لاہور: دانش سرا جنوری فروری ۱۹۹۸ء ص ۱۱۹

۱۱۔ مرتبہ پروفیسر محمد سرور، لاہور: سندھ ساگر اکادمی (ایک تازہ اشاعت: اکتوبر ۱۹۹۶ء)



۱۲۔ مولانا عبید اللہ سندھی۔ حالات زندگی، تعلیمات، سیاسی افکار۔ لاہور: سندھ ساگر اکادمی

۱۳۔ عبید اللہ سندھی، مولانا: ذاتی ڈائری، لاہور: مکی دار الکتب س۔ن، ص ۳۰

۱۴۔ مولانا کو سال اشاعت سے متعلق اشتباہ ہوا۔ یہ مضمون معارف فروری ۱۹۳۲ء میں شائع ہوا۔

۱۵۔ معارف اعظم گڑھ فروری ۱۹۳۳ء

۱۶۔ پٹنہ: ۱۹۳۴ء (۱۹۸۵ء میں دار الدعوۃ السلفیہ لاہور نے یہ کتاب از سر نو شائع کی)

۱۷۔ امین احسن اصلاحی: تدبر قرآن، لاہور: فاران فاؤنڈیشن ۱۹۸۳ء ج ۸ ص ۱۰۲

۱۸۔ امین احسن اصلاحی: محولہ بالا ص ۱۰۶

۱۹۔ مولانا ابو الکلام آزاد نے ایک دوسرے بحث میں قرآن کریم سے بجائے اصلح Survival of the Fittest کی جگہ بقائے انفع کے اصول کا استنباط کیا ہے۔
رک "ام الکتاب" یعنی تفسیر سورۃ الفاتحہ، لاہور: اسلامی اکادمی ۱۹۷۵ء ص ۹۶

۲۰۔ مولانا امین احسن صاحب مرحوم نے ایک جگہ "نفخت فیہ من روحی" الایہ کے تحت نفس ناطقہ یا روح الٰہی (Divine spark) کی بحث میں ڈارون کے مادی نظریے پر ذیل کا تبصرہ کیا ہے:
"جو لوگ ڈارون کے مادہ پرستانہ نظریہ ارتقاء کے اندھے بہرے معتقد ہیں وہ انسان کے اس باطنی نور سے بالکل بے خبر ہیں اور یہی بے خبری ہے جس کی وجہ سے وہ انسان کے بہت سے میلانات کی یا تو سرے سے کوئی توجیہ کر ہی نہیں پاتے یا کرتے ہیں تو بالکل غلط کرتے ہیں"
امین احسن اصلاحی: تزکیہ نفس (مکمل دونوں حصے)، فیصل آباد: ملک سنز ۱۹۸۱ء ص ۲۳۳

۲۱۔ آیت ۳۲

۲۲۔ تفصیل کے لیے تفسیر سورۃ الانعام اور سورۃ النحل

۲۳۔ تدبر قرآن میں یہ بحث جلد دوم صفحہ ۲۳۵، ۲۳۶ پر ملاحظہ فرمائی جا سکتی ہے (لاہور: انجمن خدام القرآن: ۱۹۷۶ء)

۲۴۔ سلطان شوکت کریم، عمر سیف، دانیال احمد خواجہ

۲۵۔ ان میں سے کچھ حالات کا تذکرہ خود مولانا مرحوم نے تدبر قرآن جلد ہشتم کے دیباچے میں کیا ہے (صفحہ ۱۰، ۱۱) مزید تفصیلات خالد مسعود صاحب کے مضمون "علم و عرفان کے ماہ کامل کا غروب" میں ملاحظہ فرمائی جا سکتی ہیں مطبوعہ "تدبر" شمارہ ۵۹ جنوری ۱۹۹۸ء

۲۶۔ امین احسن اصلاحی: تدبر قرآن لاہور: فاران فاؤنڈیشن، ۱۹۸۳ء ج ۸ ص ۱۱

ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی

# مولانا اصلاحی سے چند باتیں

آٹھ جون کو شام پانچ بجے مشہور رسالہ "نقوش" کے توسط سے لاہور کی ڈیفنس ہاؤسنگ سوسائٹی کے "رابعہ کاٹیج" پہنچا۔ رابعہ کاٹیج کی خوبصورتی کو دیکھتے ہی تاج محل کا حسن ذہن میں کروٹیں بدلنے لگا اور غیر شعوری طور پر یہ کلمات زبان پر چل پڑے کہ "رابعہ کاٹیج" تو لاہور کا تاج محل ہے اور یہ تاج محل کسی بادشاہ کی یادگار نہیں بلکہ یہ ایک مولوی کی رہائش گاہ ہے۔ یہ مولوی کسی زمانے میں مدرسۃ الاصلاح میں استاد ہوا کرتا تھا۔ علمی دنیا اس مولوی کو مولانا امین احسن اصلاحی کے نام سے جانتی ہے جو کئی گرانقدر کتابوں کے مصنف ہیں، جن میں ان کی کتاب "دعوت دین اور اس کا طریقہ کار" اور تفسیر "تدبر قرآن" سرفہرست ہیں۔ انہیں ترجمان القرآن مولانا حمید الدین فراہیؒ کے شاگرد ہونے کا شرف حاصل ہے۔

مولانا امین احسن اصلاحی صاحب سے ایک گھنٹہ گفتگو رہی۔ مجھے جو کچھ بھی پوچھنا ہوتا اسے کاغذ پر لکھ کر انہیں پیش کرتا چونکہ مولانا کی قوت سماعت یکسر دم توڑ چکی تھی، البتہ بولتے بالکل صاف تھے۔ نقاہت کا ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ نماز میں میرے دونوں جانب دو آدمی اس اندیشہ کے تحت ہوتے ہیں کہ کہیں میں زمین بوس نہ ہو جاؤں۔ اب زیادہ گفتگو سے بھی طبیعت گھبراتی ہے۔ ان سے کئے گئے کچھ سوالات اور ان کے جوابات پیش کئے جا رہے ہیں۔

س: مولانا ابواللیث اصلاحی ندوی صاحب کی خواہش ہے کہ آپ ہندوستان تشریف لائیں؟

ج: ابواللیث صاحب سے میرا ایک خاص تعلق ہے۔ ہندوستان سے اکثر ان کے پیغامات ملتے رہتے ہیں۔ میں ان کے جذبات و اشتیاق کی قدر کرتا ہوں۔ مجھے خود ان سے ملنے کی شدید خواہش ہے کہ ان سے مل کر کچھ حسرتیں نکالوں۔ اگر میں ہندوستان میں ہوتا تو آج میرے یہ تمام چاہنے والے میری نظروں کے سامنے ہوتے۔ انہیں میرا سلام کہو کہ وہ دین اسلام کے لیے کام کرتے رہیں۔

س: نومبر میں ہونے والے فراہی سیمنار میں ہم آپ کو لے کر چلیں گے۔ آپ صرف افتتاحی تقریر کریں۔

ج: ابھی میں نے تمہیں اپنی صحت کے بارے میں بتایا کہ میں اس قابل نہیں ہوں کہ ہندوستان چلوں۔ اگر وہاں گیا تو میرے چاہنے والوں کا تانتا بندھ جائے گا۔ جماعت اسلامی دلی ہی میں گھیر لے گی، اعزہ کو معلوم ہوا کہ میں ہندوستان آکر ان سے نہ ملا تو وہ الگ ناراض ہوں گے، مادر علمی کے فرزندان بھی مجھے گھیرے میں لے لیں گے اور اعظم گڑھ میں ایک خاص حلقہ بھی مجھے نہ بخشے گا۔ کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ تم مجھے سیدھے لے جاؤ گے اور واپس لا کر لاہور پہنچا دو گے۔ ایسا لگتا ہے کہ



تم مجھے ڈربے میں بند کر کے رکھو گے۔ میرے جانے پر ایک سیلاب پھوٹ پڑے گا اور تم اس سیلاب کو روک نہیں سکتے۔

س: فراہی سیمنار کے لیے آپ کا پیغام ریکارڈ کرنا چاہتا ہوں؟

ج: ابھی سے پیغام ریکارڈ کر کے کیا کرو گے، جب یہاں سے لوگ جائیں گے میں انہیں کچھ نہ کچھ ریکارڈ کروا کے دے دوں گا اور اگر ہو سکا تو انہیں املا کرا دوں گا۔

اسی دوران مولانا نے مجھ سے دریافت کیا کہ کیا اس سیمنار کا تعلق ادارہ علوم القرآن سے ہے۔ میں نے کہا کہ ہاں اچھے خاصے معاملات میں ادارہ علوم القرآن کے حضرات شامل ہیں۔ مولانا نے یہ بھی کہا کہ سیمنار کے سلسلے میں اگر مجھ سے رابطہ بدر الدین صاحب قائم کریں تو بہتر ہے۔

س: فراہی سیمنار میں کن کن لوگوں کو یہاں سے بھیجیں گے؟

ج: دیکھو فراہیات کے سلسلے میں یہاں دو لوگوں کا خاص تعلق ہے۔ ایک خالد مسعود اور دوسرے جاوید الغامدی۔ ان دونوں کو میں نے تاکید کی ہے کہ وہ مقالات کے ساتھ سیمنار میں شریک ہوں۔ باقی ممکن ہے کہ کچھ اور لوگ بھی جائیں۔

س: مولانا نجم الدین اصلاحی صاحب مجھے آپ کا ایک خط دکھا کر دیر تک آپ کا ذکر کرتے رہے اور آپ کے دیدار کے لئے روتے رہے؟

ج: ان سے میرا سلام کہنا، میرا بھی ان سے ایک خاص تعلق ہے۔ ایک زمانے میں انہوں نے مجھ سے بارہا اپنی کتاب "............" پر کچھ لکھنے کو کہا لیکن میں لکھنے پر اس خیال سے آمادہ نہ ہوا کہ اس میں انہوں نے مولانا حسین احمد مدنیؒ کی سیاست اور تصوف سے بحث کی ہوگی۔ مجھے ان کی سیاست سے اختلاف تو ہے ہی، تصوف کا میں سرے سے قائل ہی نہیں ہوں۔ تصوف دین اسلام کے متوازی ایک دین ہے۔ ایک مرتبہ جب مولانا حسین احمد مدنیؒ مدرسۃ الاصلاح آئے تو میں انہیں رخصت کرنے کے لئے اسٹیشن تک گیا۔ اس دوران سیاست ہی موضوع بحث رہی۔ میں نے مولانا سے کہا کہ یہ آپ جو کچھ کر رہے ہیں اس کے مسلمانوں پر اچھے اثرات نہیں پڑیں گے۔ اس کے جواب میں مولانا نے فرمایا کہ تم مجھے پہلے انگریزوں کو بھگا لینے دو، اس کے بعد سارے مسائل طے کروں گا۔ لیکن میں نے مولانا سے کہا کہ آپ کو مسلم لیگ کی یہ مخالفت زیب نہیں دیتی۔ محمد علی جناح ایک صاحب بصیرت انسان ہیں ان کی خدمات مسلمانوں کے لئے بہت ہیں۔

اس تھوڑی سی گفتگو کے بعد مولانا سے رخصت ہونے لگا تو میرا ہاتھ پکڑ کر میری پشت تھپتھپانے لگے اور مجھے اس تھپتھپاہٹ سے ایسا محسوس ہوا کہ جیسے محبت کے نغمے پھوٹ رہے ہوں۔

عبدالرزاق

# ڈائری کے چند اوراق

مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کی شخصیت اور فکر سے میں اس وقت متعارف ہوا جب وہ کبرسنی کی نقاہت کے باعث درس و تدریس کا کام چھوڑ چکے تھے۔ ان کے رفقاء وقتاً فوقتاً ان کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ شوق ملاقات مجھے بھی پہلا مرتبہ انہیں رفقاء کے ہمراہ ستمبر93ء میں ڈیفنس سوسائٹی میں مولانا کی قیام گاہ پر لے گیا۔ اس کے بعد چند ملاقاتیں اور ہوئیں۔ اپنی ڈائری کے چند اوراق پیش خدمت ہیں۔

## 24 ستمبر1993ء

آج ادارہ تدبر قرآن و حدیث کے رفقاء کے ہمراہ مولانا امین احسن اصلاحی صاحب سے ملنے گیا۔ ہم تین افراد تھے۔ ملکی انتخابات قریب ہیں اور جماعت اسلامی نے تنہا انتخاب لڑنے کا فیصلہ کیا ہے۔ مولانا اصلاحی جماعت کی اس پالیسی پر بے حد افسردہ تھے۔ ان کا خیال یہ تھا کہ اس طرح پیپلزپارٹی کے ہاتھ مضبوط ہوں گے ؛ حالانکہ اس وقت سیکولر طاقتوں کا راستہ روکنے کی ضرورت تھی۔ مولانا نے فرمایا کہ نواز شریف اور ان کی پارٹی باقی سب سے بہتر ہیں۔ اس لیے ووٹ ضائع کرنے کی حماقت ہرگز نہیں کرنی چاہیے۔

دوران گفتگو سرسید، اقبال اور قائداعظم کا ذکر بھی ہوا اور مولانا نے ان کے قومی کردار کی تعریف کی۔ مولانا کی باتیں نہایت دلکش تھیں۔ انہوں نے کسی مرحلے میں بھی مجلس پر بوریت طاری نہیں ہونے دی۔

## ۳۱ اکتوبر ۹۳ء

مولانا سے ملاقات بڑے خوشگوار ماحول میں ہوئی۔ انہوں نے بڑی دلچسپ باتیں کیں۔ میں نے مولانا سے سوال کیا کہ پچھلے دنوں اخبار میں ایک مضمون شائع ہوا ہے جس میں مضمون نگار نے کہا ہے کہ "مولانا مودودی قرآن کی تفسیر میں اصلاحی صاحب سے مدد لیا کرتے تھے" یہ بات کہاں تک درست ہے۔ یہ سوال پڑھ کر مولانا مسکرائے اور کہا کہ "بھئی ہمیں کون لڑوانا چاہتا ہے"۔ انہوں نے سوال کا جواب تو نہ دیا البتہ مولانا مودودی کے بارے میں بڑی دلچسپ باتیں بتائیں۔ انہوں نے کہا کہ پٹھان کوٹ میں نہر کے کنارے مولانا مودودی اپنے کارکنوں کے ہمراہ بیٹھا کرتے تھے اور درس وغیرہ کی شکل ہو جاتی تھی۔ اصلاحی صاحب کا کہنا تھا کہ وہ محفل کی ایک جانب پاؤں نہر کے اندر ڈال کر زور زور سے ہلایا کرتے اور اس طرح پاؤں ہلانے سے انہیں بڑا مزا آتا۔



## ۲۶ نومبر ۹۳ء

مولانا کی باتوں سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ ملکی حالات سے بے حد مایوس تھے۔ خاص طور پر بے نظیر کے حکومت میں آنے کی وجہ سے ذہنی طور پر پریشان تھے۔ بار بار ملکی حالات پر گفتگو کرتے ہوئے مایوسی کا اظہار کرتے۔ انہوں نے بے نظیر سے اپنی شدید بیزاری ظاہر کی۔

دوران گفتگو ڈاکٹر اسرار صاحب کا ذکر آیا تو فرمانے لگے کہ کچھ دن پہلے چند نوجوان دانشور ملنے کے لیے آئے اور دینی جماعتوں کے بارے میں سوالات پوچھنے لگے۔ میں انکار کرتا رہا کہ بھئی میں ان کے بارے میں صحیح معلومات نہیں رکھتا اس لیے ان کے بارے میں صحیح رائے نہیں دے سکتا۔ مگر جب انہوں نے ڈاکٹر اسرار کے بارے میں پوچھا تو میں نے فوراً جواب دیا کہ میں اس شخص کے بارے میں سب کچھ جانتا ہوں کیونکہ "ڈاکٹر اسرار میرے پاس ۲۵ برس نہیں رہے بلکہ میں ان کے ساتھ رہا ہوں"۔

جیسے ہی مولانا نے یہ کہا تمام لوگ مسکرانے لگے۔

## ۲۸ جنوری ۱۹۹۴ء

آج مولانا کافی دیر تک گفتگو کرتے رہے۔ روانی کے ساتھ گفتگو کی۔ مختلف سوالوں کے جوابات بھی دیے۔ مولانا نے فرمایا کہ انہیں نوجوانی میں فلسفہ سے خاص لگاؤ رہا۔ وہ مختلف فلسفیوں کی کتابوں کو بڑے شوق سے پڑھتے تھے۔ انہوں نے کہا کہ قرآن حکیم کا فہم ہونے کے بعد انہوں نے فلسفہ کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ان فلسفیوں کے نام تک بھول گئے جن کی کتابیں وہ بڑے شوق سے پڑھا کرتے تھے۔

مولانا نے خاص طور پر مارکس آریلیس کا نام لیا اور کہا کہ میں فلسفہ میں اس کا مرید ہوں۔ اس فلسفی سے مولانا بڑے متاثر نظر آرہے تھے۔ انہوں نے اپنے ساتھیوں کو نصیحت کی کہ اگر وہ اپنے آپ کو پہچاننا اور زندگی کی حقیقت کو جاننا چاہتے ہیں تو وہ مختلف حکماء اور فلسفیوں کی کتابوں کو ضرور پڑھیں۔ ان کو پڑھنے کے بعد آپ کو پتہ چلے گا کہ جس فلسفی کو حقیقت کا ادراک ہو گیا اس کو سب کچھ مل گیا۔ وہ روم اور ایران کی بادشاہی کو اپنے قدموں تلے کچل دیتا ہے۔ اس میں اتنی ہمت ہوتی ہے کہ وہ بادشاہ کی کسی غلطی پر اسے پورے دربار کے سامنے ڈانٹ پلا دیتا ہے۔ ایسا شخص بادشاہ کو بھی خاطر میں نہیں لاتا۔

## ۲۵ مارچ ۹۴ء

حسب معمول مولانا امین احسن اصلاحی صاحب خوشگوار موڈ میں تھے۔ دوران گفتگو انہوں نے بتایا کہ پچھلے دنوں برطانیہ کی لیڈز یونیورسٹی کے پروفیسر Dr. Neal Robinson ان سے ملنے آئے۔ انہوں نے "نظم قرآن" کے حوالے سے گفتگو کی اور مختلف سوالات بھی کیے۔ مولانا نے کہا کہ یہ پہلا موقع ہے کہ

کوئی انگریز سکالر ان سے ملنے آیا۔ مولانا کا خیال تھا کہ پروفیسر صاحب کسی حد تک نظم قرآن کے قائل ہو چکے تھے۔

مولانا نے گہری سنجیدگی سے فرمایا کہ اگر عام کتابوں میں نظم پایا جاتا ہے تو یہ کس طرح ممکن ہے کہ دنیا کی سب سے بڑی کتاب نظم سے خالی ہو۔ قرآن میں نظم ہے اور یقیناً ہے' یہ اور بات ہے کہ اس حقیقت کو پانے کے لیے ہمیں محنت کرنی ہو گی' جدوجہد کرنی ہو گی۔ مولانا نے اس مرحلے پر شگفتہ انداز میں کہا کہ ان کے نزدیک جو شخص قرآن میں نظم کا قائل نہیں وہ واجب القتل ہے۔

مولانا نے کہا کہ انہیں کوثر نیازی صاحب کی وفات کا بڑا دکھ ہوا ہے۔ انہوں نے کوثر نیازی کی تعریف کی اور کہا کہ کچھ معاملات میں ہم میں اختلافات بھی رہے مگر میں نے اس سے تعلقات نہیں توڑے۔ کوثر نیازی بھی جب مجھ سے ملتے' ادب و احترام ہی سے ملتے تھے۔

مولانا جماعت اسلامی کے موجودہ کردار سے بڑے مایوس تھے۔ انہوں نے کہا کہ مولانا مودودی نے سیاست کے میدان میں آ کر اچھا نہیں کیا۔ میں خوب سمجھتا تھا کہ ہمارے امیر سیاست سے ناآشنا ہیں اور ہمیں بے وقوف بنا رہے ہیں۔

مولانا نے اپنے ساتھیوں سے شگفتہ انداز میں کہا کہ میں نے جماعت اسلامی کو شروع دن سے سیاسی سمجھا ہی نہیں۔ اگر آپ لوگ سمجھتے ہیں کہ میں بھی سیاست میں ملوث تھا تو یہ آپ کا مجھ پر الزام ہو گا۔

## ۲۸ اپریل ۹۴ء

آج مولانا کی طبیعت اتنی اچھی نہ تھی کہ وہ اٹھ بھی سکتے' اس لیے ہم خود ہی ان کے کمرے میں چلے گئے۔ مولانا کمرے میں بیڈ پر آرام فرما رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد تکیے کی ٹیک لگا کر بیٹھ گئے اور آہستہ آہستہ گفتگو کی۔ میرے لیے یہ بات بڑی حیرت کی ہے کہ اتنی ضعیفی اور کمزوری کے باوجود مولانا کی حس مزاح اور شگفتگی ابھی تک برقرار ہے۔ مولانا کا موقع و محل کے مطابق مزاح بہت ہی اعلیٰ پائے کا ہوتا ہے۔

دوران گفتگو' مولانا کسی صاحب کی حدیث کے بارے میں لکھی ہوئی کتاب کی تعریف کر رہے تھے جو ان کے زیر مطالعہ رہی تھی۔ پھر کہنے لگے کہ "میں نے بھی بہت کتابیں پڑھی ہوئی ہیں لیکن جب کتاب لکھتا ہوں تو حوالوں کے لیے صرف ایک دو کتابوں کے نام لیتا ہوں' زیادہ حوالے نہیں دیتا"۔

## ۲۹ جولائی ۹۴ء

آج مولانا سے ۳ ماہ بعد ملاقات ہوئی۔ ملاقات نہ ہونے کی وجہ سے میں کچھ اداس سا ہو گیا تھا۔

اس بار بھی مولانا نے بڑی دلچسپ باتیں کیں۔ کہنے لگے کہ میں حیران ہوتا ہوں کہ میں نے اتنی کتابیں لکھ کیسے لیں۔ آج تو ایک صفحہ تک نہیں لکھ سکتا اور حیرت ہوتی ہے کہ میں نے ۹ جلدوں پر مشتمل



تدبر قرآن تک لکھ ڈالی۔ مولانا نے مزید کہا کہ وہ آجکل اپنی ہی لکھی ہوئی تحریروں کو پڑھ رہے ہیں اور بعض اوقات تو انہیں خود اپنی لکھی ہوئی تحریر پر یقین نہیں آتا کہ میں نے کیسے لکھ لی۔

مولانا نے مولانا حمید الدین فراہیؒ کی بے حد تعریف کی اور کہا کہ وہ بڑے ذہین شخص تھے۔ اگر وہ برطانیہ جیسے ملک میں ہوتے تو زیادہ بہتر کام کر سکتے تھے۔ آخر میں مولانا نے اپنے ساتھیوں کو محنت اور جدوجہد کرنے کو کہا تاکہ وہ اس فکر کو پروان چڑھا سکیں۔

## ۱۸ اکتوبر ۹۶ء

آج مولانا سے تقریباً ۲ سال بعد ملاقات کی۔ ملاقات کیا کی فقط ان کی زیارت ہی کی۔ مولانا کو دیکھ کر بے حد دکھ اور افسوس ہوا۔ وہ اپنے بستر پر لیٹے تھے۔ وہ نہایت کمزور اور نحیف ہو چکے ہیں۔ فالج کے حملہ کے بعد ان کی سماعت اور گویائی شدید متاثر ہوئی ہے اور اب بمشکل ہی پہچانتے ہیں۔

خالد مسعود صاحب نے مولانا کو پشت سے تکیہ کی ٹیک دے کر بٹھائے رکھا۔ مولانا کبھی کبھی چہرہ اوپر کر کے ساتھیوں کو دیکھتے مگر اب ان کی آنکھوں اور ان کے چہرے کے تاثرات سے واضح تھا کہ وہ خود بڑی بے بسی محسوس کر رہے ہیں۔ مولانا کی یہ حالت دیکھ کر میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میرے سامنے صدی کا سب سے بڑا مفسر قرآن تھا جو اب نہ خود حرکت کر سکتا تھا نہ اپنے اظہار کے لیے بولنے پر قادر تھا۔ ایسی بے بسی' ایسی مجبوری----- ! مولانا کے پاس ہم آدھا گھنٹہ بیٹھے رہے۔

## ۱۵ جون ۹۷ء

آج ادارہ کے اراکین کے ساتھ مولانا اصلاحی صاحب کی عیادت کے لیے گیا۔ اکتوبر ۹۶ء میں مولانا کی جو حالت تھی اس کی نسبت اب وہ کافی بہتر تھے۔ صحت بھی اچھی لگ رہی تھی۔ انہوں نے ساتھیوں کو پہچان لیا۔ قوت گویائی متاثر ہونے کی وجہ سے وہ مدعا بیان نہیں کر سکتے تھے۔ مولانا اپنے ساتھیوں سے باتیں کرنا چاہتے تھے اور کوشش بھی کی مگر اس کا سمجھنا بڑا مشکل کام ہے۔ وہ بس اونچی آواز سے کچھ کہہ دیتے ہیں جسے سمجھا نہیں جا سکتا۔

دوران ملاقات' اسلام آباد سے معروف دینی سکالر ڈاکٹر محمود غازی صاحب بھی مولانا کی عیادت کے لیے آ گئے۔ نعمان صاحب مولانا کی صحت کے بارے میں ساتھیوں کو بتاتے رہے۔

## ۱۰ اگست ۹۷ء

جب ہم ملاقات کے لیے گئے تو مولانا نے ساتھیوں کو پہچان لیا۔ ملازم نے بتایا کہ مولانا کی کل رات طبیعت خراب ہو گئی تھی اور انہیں سانس لینے میں بڑی دقت پیش آ رہی تھی۔ اب وہ کافی بہتر حالت میں ہیں۔

کچھ دیر بعد مولانا کو میں نے سہارا دے کر اٹھایا اور کمر کے پیچھے تکیہ رکھ دیا۔ اس دوران مولانا زور

بقیہ صفحہ 90 پر

تاثرات

جسٹس (ر) محمد افضل چیمہ

# نابغہ روزگار محقق

برصغیر کے ممتاز عالم دین و محقق حضرت مولانا امین احسن اصلاحی طویل علالت کے بعد ہم سے رخصت ہو گئے اور میں خرابی صحت کی وجہ سے نماز جنازہ میں شرکت کی سعادت سے بھی محروم رہا جس کی حسرت آخری دم تک رہے گی۔

اگرچہ مفکر اسلام حضرت مولانا مودودیؒ کی خدمت میں پہلی مرتبہ حاضری کا شرف مجھے ۱۹۳۶ء میں پٹھان کوٹ ضلع گورداسپور میں نہر اپر باری دوآب پر واقع دارالسلام میں ہوا۔ ان کے نائب' معاون خصوصی' متبحر عالم دین حضرت مولانا امین احسن اصلاحی سے پہلی مرتبہ ملاقات کی سعادت 1951 کے اوائل میں جماعت اسلامی کے مرکز اچھرہ لاہور میں حاصل ہوئی جبکہ میں پنجاب اسمبلی کے منتخب رکن کی حیثیت سے بطور ممبر حزب اختلاف رہنمائی کیلئے حاضری دیا کرتا تھا۔

جس طرح سائنس کے میدان میں ہکسلے اور ڈاروِن کا ذکر ممتاز ترین شخصیات کی حیثیت سے بیک زبان لیا جاتا ہے' یا انگریزی زبان کے نامور ادباء کے طور پر شیکسپیئر اور ملٹن کا ذکر عموماً بیک وقت کیا جاتا ہے' یا پھر کمیونزم کے سلسلہ میں ہیگل اور مارکس کے نام عام طور پر اکٹھے لئے جاتے ہیں اسی طرح عصر حاضر کے متبحر علماء اور جامع العلوم شخصیات کے طور پر بالعموم' اور جماعت اسلامی کے مؤسسین اور قائدین کی حیثیت سے بالخصوص' مولانا مودودی اور مولانا اصلاحی کے اسماء گرامی کا ذکر خیر ایک ساتھ کیا جاتا رہا ہے۔ اللہ کریم نے دونوں نابغہ روزگار شخصیتوں کو فوق الفطرتی صلاحیتوں سے نوازا تھا جنہیں دینی علوم پر محققانہ عبور کے علاوہ عصری علوم والسنہ' بشمول انگریزی' پر بھی غیر معمولی دسترس تھی۔ چنانچہ انہوں نے عمر بھر کے لیے اپنی تمامتر علمی توانائیوں اور دماغی صلاحیتوں کو تفقہ فی الدین' محققانہ تصنیف و تالیف کے ذریعہ خدمت اسلام' دینی علوم کی نشر و اشاعت اور اقامت دین کیلئے وقف کر دیا اور قیام پاکستان کے بنیادی مقصد کے حصول یعنی زندگی کے ہر شعبہ میں نفاذ اسلام اور ایک صحیح اسلامی معاشرہ کے قیام کیلئے عملی جدوجہد اور جستجو جاری رکھی جس کے لیے انہیں قید و بند کی مصیبتوں سے بھی گزرنا پڑا مگر ان کے پائے استقلال میں لغزش نہ آئی۔ لیکن دونوں علماء کرام کے شاہکار اور تاریخی کارنامے ان کی جامع اور مبسوط تفاسیر تفہیم القرآن اور تدبر قرآن ہیں جو اپنی منفرد امتیازی خصوصیات سے مزین اور ممیز ہیں۔ جہاں تفہیم القرآن میں قرآنی احکام و تعلیمات کی توضیح و تشریح نہایت سلیس' سادہ اور عام فہم زبان میں کی گئی ہے وہاں اس دور تخصیص میں تدبر قرآن علماء کرام اور محققین اسلام کے لئے عدیم النظیر علمی سرمایہ



ہے۔

حضرت مولانا اصلاحی نے محض قرآن کریم کی زبان' الفاظ و تراکیب اور محاورات کے فہم و ادراک کے لئے سالہا سال کی محنت شاقہ سے دور جاہلیت کے تمام عرب شعراء کے کلام کا مطالعہ بالاستیعاب ابتداء سے انتہا تک کیا اور اپنے استاد گرامی حضرت مولانا حمید الدین فراہیؒ کے زیر تربیت آیات قرآنی کے ربط و ضبط اور نظم و ترتیب کی مجتہدانہ تحقیق کو پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ انہوں نے قرآن کریم کی حکیمانہ ترتیب اور منطقی تسلسل Logical Sequence کے راز ہائے سربستہ کو طشت ازبام کیا۔

میں تحدیث نعمت کے طور پر عرض کروں گا کہ مجھے حضرت مولانا کی غیر معمولی شفقت کا شرف حاصل رہا ہے جسے میں اپنی انتہائی سعادت سمجھتا ہوں۔ چنانچہ میں نے انہیں بہت قریب سے دیکھا۔ مولانا کے مزاج میں جمال و جلال کا حسین امتزاج تھا۔ روزمرہ کی گفتگو میں بھی مزاح و شگفتگی کے علاوہ منطقیت اور بلاغت نمایاں ہوتی تھی۔ مجھے یاد ہے ایک مرتبہ کافی عرصہ کے بعد ملاقات ہوئی۔ میں نے صحت کا حال دریافت کیا۔ فرمانے لگے "دوران سر کی تکلیف ہے' گراں گوشی بھی ہے' کسی کی سنتا نہیں اپنی سنائے جاتا ہوں۔ کراچی گیا تھا۔ وہاں ڈاکٹروں نے جدید آلات سے معائنہ کیا' دوائیں تجویز کیں مگر چنداں افاقہ نہیں ہوا"۔

۱۹۵۷ء میں جب ماچھی گوٹھ کے تاریخی اجلاس کے بعد حضرت مولاناؒ نے بعض دیگر رفقاء کے ساتھ جماعت اسلامی سے علیحدگی اختیار کی تو کچھ عرصہ بعد "ترجمان القرآن" اور "میثاق" میں دونوں Intellectual Giants اور تاریخ ساز شخصیتوں کے مابین علمی محاذ آرائی اور قلمی جنگ کا آغاز ہوا۔ اسلام پسند عناصر کو جماعت اسلامی کی اس تفریق سے انتہائی صدمہ ہوا کیونکہ بلاشبہ فاضل اور مخلص موسسین کے ایک معتدبہ حصہ کی علیحدگی سے جماعت کی ساکھ' کارکردگی اور لائحہ عمل کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا۔ "ترجمان القرآن" میں حضرت مولانا مودودیؒ اور "میثاق" میں حضرت مولانا اصلاحیؒ اپنے اپنے موقف اور نقطہ نگاہ کی تائید و حمایت میں دلائل و براہین پیش فرماتے جنہیں میں باقاعدگی سے پڑھتا۔ اور سچی بات یہ ہے کہ قانونی پس منظر اور پیشہ وکالت سے تعلق کے باوجود ہر ایک کے دلائل مجھے اپنے ساتھ بہالے جاتے اور میرے لئے کسی ایک نقطہ نگاہ کا انتخاب یا اس کی ترجیح کا فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا۔ جب مولانا مودودی کے دلائل پر غور کرتا تو ان کا ہم خیال ہو جاتا اور جب مولانا اصلاحی کی قوت استدلال اور منطقیت سے واسطہ پڑتا تو اس سے متاثر ہو جاتا۔

یہ ایک معروف حقیقت ہے کہ انگریز کے دور حکومت میں احوال شخصی کی حد تک' ماسوائے زرعی اراضی کی وراثت کے' مسلمانوں کے جملہ متنازعہ مسائل اور مقدمات کے عدالتی فیصلے فقہ اسلامی کے مطابق ہوتے تھے۔ چونکہ انگریز ججوں کو اسلام کے بنیادی فقہی اصول کا مناسب علم نہیں ہوتا تھا لہٰذا وہ محض

"الھدایۃ" کے انگریزی ترجمہ کی مدد سے فیصلے کرتے تھے جو فقہی پس منظر کے فقدان کی وجہ سے غلط بھی ہوتے اور انہیں بطور نظائر قابل قبول یا قابل تقلید تسلیم کرنا دشوار ہوتا تھا۔ چنانچہ اسی نوعیت کے ایک مقدمہ کے سلسلے میں جس کا تعلق نومولود بچے اور اس کی ماں کے سابقہ نان و نفقہ کی ذمہ داری "Past maintenance" کے تعین سے تھا میں رہنمائی کیلئے حضرت مولاناؒ کی خدمت اقدس میں حاضر ہوا۔ آپ نے فوراً امام ابن قیم کی معروف تصنیف "زاد المعاد" سے متعلقہ توضیح و تشریح نکال کر پیش فرما دی جس سے تمام شکوک و شبہات کا ازالہ ہو گیا اور مستند انداز میں مسئلہ کی مکمل طور پر وضاحت ہو گئی۔ چنانچہ میں نے متعلقہ عبارت جو عربی زبان میں تھی نقل کر لی اور یہ اقتباس اپنے فیصلہ میں من و عن درج کر دیا۔ یہ فیصلہ مطبوعہ عدالتی فیصلوں میں شامل ہے اور بحمد اللہ حضرت مولانا مرحوم کی رہنمائی کی وجہ سے قطعی سند کی حیثیت رکھتا ہے۔ جس سے ہر طرح کے اشکالات رفع ہو گئے۔

فقہی مسائل میں دیانتدارانہ اختلاف رائے ایک مسلمہ حقیقت اور روزمرہ کے مشاہدہ کی بات ہے جس کا بڑا ثبوت ہمارے مذہبی مسالک ہیں۔ ہماری اعلیٰ عدالتوں' ہائی کورٹس اور سپریم کورٹ میں تو یہ روزمرہ کے معمول اور مشاہدہ کا معاملہ ہے۔ انسانی جان کو جو تقدس قرآن کریم نے عطا فرمایا ہے اس کا اندازہ اس آیت کریمہ سے ہو سکتا ہے **"من قتل نفسا بغیر نفس او فساد فی الارض فکانما قتل الناس جمیعا"** اور بطور سابق جج سپریم کورٹ آئے دن قتل کے مقدمات میں اختلاف رائے میرے ذاتی تجربہ اور مشاہدہ کی بات تھی۔ سپریم کورٹ میں ایک عرصہ تک مقدمہ قتل کی اپیلوں کی سماعت کے لئے چیف جسٹس حمود الرحمٰن مرحوم' برادرم صلاح الدین اور مجھ پر مشتمل سہ رکنی بینچ قائم رہا۔ بحمد اللہ ہم تینوں مسلمان تھے۔ اللہ کریم کے نزدیک مسئولیت کا شدید احساس رکھتے تھے۔ کمرہ عدالت میں بیٹھنے سے پہلے اللہ کریم سے رہنمائی اور صحیح فیصلے کی توفیق کی دعا مانگتے تھے۔ دوران سماعت وکلاء پہلے واقعاتی پہلو کی وضاحت کرتے۔ پھر ایک ہی شہادت کا تجزیہ پیش کرتے' ایک ہی قانون کی تعبیر و تشریح کرتے جس کا اطلاق ایک ہی واقعات پر کیا جاتا مگر زندگی اور موت کے ان مسائل میں ہم تینوں کے مابین دیانتدارانہ اختلاف رائے معمول کی بات تھی۔ ایک مقدمہ میں میری اور حمود الرحمٰن مرحوم کی متفقہ رائے تھی کہ اپیل منظور اور سزائے موت منسوخ ہونی چاہیے جبکہ صلاح الدین صاحب نے اس کے برعکس ایک طویل اور مدلل فیصلہ ہائی کورٹ کے فیصلے اور سزائے موت کی توثیق میں تحریر فرمایا۔ اسی طرح ایک دوسرے کیس میں میں اور صلاح الدین صاحب متفق تھے اور حمود الرحمٰن صاحب نے اختلافی judgement تحریر فرمائی اور بلاشبہ یہی وجہ ہے کہ دیانتدارانہ اختلاف رائے کو حضور اکرم ﷺ نے امت کیلئے باعث رحمت قرار دیا ہے۔ ہماری انتہائی بدقسمتی ہے کہ اپنے متشددانہ اور متعصبانہ رویہ کی وجہ سے جو بالعموم کم علمی اور خود غرضی پر مبنی ہوتا ہے ہمارے علماء نے امت مسلمہ کو اسلام کے نام پر



سنگین فرقہ پرستی میں مبتلا کر دیا ہے جس کی وجہ سے فرقہ وارانہ قتل و غارت اور دہشت گردی آج ہمارا سب سے بڑا قومی مسئلہ ہے۔ اگرچہ حضرت مولانا کے دور میں فقہی مسائل کے اختلافات میں تعصب و تشدد کی وہ کیفیت نہیں تھی جو آج ہم دیکھ رہے ہیں تاہم ان کی نگاہ دور رس نے ان اختلافات سے امت مسلمہ کی وحدت اور اتحاد کو جو خطرہ تھا اسے محسوس کیا اور ان کو رفع کرنے کے لیے نہایت مدبرانہ اور معقول تجاویز اپنی مشہور تصنیف "فقہی اختلافات کا حل" میں پیش فرمائیں جس کے انگریزی ترجمہ کا پیش لفظ تحریر کرنے کی سعادت اس احقر کو نصیب ہوئی۔

اللہ کریم نے حضرت مولانا اصلاحی کو تبحر علمی کے ساتھ غیر معمولی مجتہدانہ اور محققانہ صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ وہ انتہائی وسیع النظر اور صاحب بصیرت عالم دین تھے۔ اگر کسی ایک فقہی مسئلہ پر وہ پورے شرح صدر سے علی وجہ البصیرت ایک رائے قائم کر لیتے تو اس کا اظہار پورے وثوق و اعتماد سے فرماتے اور اس کی تائید و حمایت میں اپنے دلائل بغیر کسی ذہنی تحفظ کے پوری قوت استدلال سے پیش فرماتے۔ چنانچہ "جلد اور رجم" کے معاملہ میں مولانا کا نقطہ نظر سربحا اختلافی نوعیت کا تھا جو علماء کرام میں زیر تنقید رہا۔ برادر محترم جسٹس (ریٹائرڈ) صلاح الدین صاحب نے بطور چیف جسٹس وفاقی شرعی عدالت اس مسئلہ میں مولانا کے نقطہ نگاہ کو ہی مرجح سمجھتے ہوئے متقدمین کی رائے سے انحراف کیا جس پر علمائے کرام نے شدید ردعمل کا مظاہرہ کیا۔ مگر مولانا بدستور اپنے موقف پر قائم رہے جو ان کی Courage of conviction کا بین ثبوت ہے۔

مگر اسی سلسلہ میں ایک دوسرے واقعہ کا ذکر بے محل نہ ہو گا۔ فیلڈ مارشل ایوب خان اور مس فاطمہ جناح کے مابین صدارتی انتخاب کے دوران جماعت اسلامی نے حضرت مولانا مودودیؒ کی منظوری سے فیلڈ مارشل کے مقابلہ میں مس فاطمہ جناح کی حمایت کا فیصلہ کیا۔ اس میں چوہدری محمد علی سابق وزیر اعظم بھی ان کے ہم خیال تھے۔ اس کے برعکس مولانا اصلاحی "عورت کی سربراہی کی شرعی ممانعت کے قائل تھے۔ چوہدری محمد علی نے اپنے متعدد بیانات اور تقاریر میں فیلڈ مارشل پر سخت تنقید کرتے ہوئے مس فاطمہ جناح کی حمایت میں دلائل دیئے' جس سے مولانا اصلاحی کو شدید اختلاف تھا۔ چنانچہ انہوں نے چوہدری محمد علی کے خلاف سخت تنقیدی بیان دیا جس سے چوہدری صاحب کی تنقیص و تحقیر کا پہلو نمایاں تھا۔ معلوم ہوتا ہے بعد میں حضرت مولانا کو چوہدری صاحب کے جذبات مجروح ہونے کا خیال آیا چنانچہ وہ بہ نفس نفیس چوہدری صاحب کی خدمت میں تشریف لے گئے' ان سے معذرت بھی کی اور ان کی خدمت میں "تدبر قرآن" کی پہلی جلد بھی پیش کی۔ اس ملاقات میں احقر کو بھی معیت کا شرف حاصل تھا۔ چوہدری صاحب مرحوم مجھ سے بھی ناراض تھے مگر بکمال شفقت صفائی قلب کا اظہار فرمایا۔

میرے نزدیک حضرت مولانا مرحوم سے نصف صدی پر محیط تعلقات کا اہم ترین اور ناقابل فراموش

واقعہ مولانا کے وہ چند تاریخی کلمات ہیں جو ان کی زبان سے اپنے صاحبزادے ابو صالح اصلاحی کی قاہرہ کے ہوائی حادثہ میں اچانک وفات کے موقع پر نکلے۔ حادثہ کی خبر سن کر ہم سب مولانا کی خدمت میں حاضر تھے۔ غمزدہ نیازمندوں کا ایک ہجوم تھا اور سب خاموش بیٹھے تھے کہ مولانا نے خود ہی مہر سکوت توڑی اور فرمایا "حضرات' میں خود ہی بات کرتا ہوں۔ مجھے آپ کے جذبات کا پورا پورا احساس ہے جس کے لیے میں بہت ممنون ہوں۔ اس بات پر تو میرا قلب اور ذہن بالکل مطمئن ہیں کہ اللہ کی مشیت کبھی غلط ہو نہیں سکتی۔ یہ جو کچھ ہوا ہے ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔ بس میری آپ حضرات سے درخواست ہے کہ دعا فرمائیں کہ اللہ کریم مجھے اس عمر میں یہ صدمہ صبر و تحمل سے برداشت کرنے کی توفیق عطا فرمائیں"۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ حضرت مولانا کے یہی الفاظ میں نے اپنی چھوٹی بچی کی اچانک وفات کے موقعہ پر اعزہ اور احباب کے تعزیتی اجتماع میں دہرائے اور ان سے دل کو ایک گونہ اطمینان نصیب ہوا۔ مولانا کے یہ تاریخی کلمات جہاں صبر و شکر' رضا بالقضاء اور توکل علی اللہ کا مظہر ہیں وہیں اللہ تعالیٰ کے نظام تکوینی کے غیر معمولی شعور پر بھی دلالت کرتے ہیں۔

مجھے حضرت مولانا کے تعمیل ارشاد کے طور پر ان کی دو کتابوں "فقہی اختلافات کا حل" اور "اسلامی قانون کی تدوین" کے انگریزی تراجم کے پیش لفظ تحریر کرنے کی سعادت حاصل ہے۔ البتہ مجھے اس بات کی حسرت ہے کہ باوجود دلی خواہش اور تمنا کے میں مولانا کی محققانہ تصنیف "مبادی تدبر حدیث" کا انگریزی ترجمہ نہ کر سکا جس کی سب سے بڑی وجہ بینائی کا متاثر ہونا تھا۔

۱۹۸۸ میں جنرل محمد ضیاء الحق مرحوم کے دور میں جب مجھے اسلامی نظریاتی کونسل کا پہلا ہمہ وقتی چیئرمین مقرر کیا گیا تو میری دلی خواہش تھی کہ مولانا اس کی رکنیت قبول فرمالیں۔ اس سلسلہ میں میں خود بھی ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور جنرل صاحب مرحوم بھی ان سے درخواست کرنے کے لیے ان کے ہاں لاہور تشریف لے گئے' مگر کسی سرکاری منصب سے وابستگی مولانا کے لئے قابل قبول نہ تھی۔ چنانچہ اسی سلسلہ میں میں نے ان کی کتاب "فقہی اختلافات کا حل" کے پیش لفظ میں اپنی اس حسرت کا اظہار کیا۔

مجھ پر حضرت مولانا کی انتہائی شفقت' سب سے بڑا کرم اور احسان عظیم' جس کا میں تحدیث نعمت کے طور پر ذکر کرتا ہوں' یہ ہے کہ ماہ رمضان المبارک ۱۳۸۸ھ میں "تدبر قرآن" کی پہلی جلد کا ہدیہ بہ نفس نفیس اپنے دست مبارک سے فارسی کا یہ شعر تحریر فرما کر اپنے دستخطوں کے ساتھ اس احقر کو عطا فرمایا:۔

شرح مجموعہ گل مرغ سحر می داند
نہ کہ ہر کو ورقے خواند معانی دانست

حضرت مولانا سے میری آخری ملاقات' جس نے مجھے کافی عرصہ خیالات میں مستغرق اور پریشان رکھا'



ان کی وفات سے پانچ ماہ پیشتر ہوئی۔ مجھے یہ تو معلوم تھا کہ مولانا کی صحت خراب ہے مگر اس کا ہرگز علم نہ تھا کہ ان پر فالج کا شدید حملہ ہو چکا ہے اور انہیں پہچاننے اور بات کرنے میں دشواری ہو گئی ہے۔ اچانک ان کی یہ حالت دیکھتے ہی مجھے سخت دھچکا لگا۔ یہ کیفیت دیکھ کر میں زیادہ دیر ٹھہر نہ سکا اور کافی دیر تک سوچتا رہا کہ زندگی اور موت کے لاینحل مسائل کا تعلق اللہ کریم کے نظام تکوینی سے ہے اور اپنے جن بندوں کو اس نے دین کی اس قدر خدمت کی توفیق عطا فرمائی ہے انہیں اذیت ناک طویل علالت کے بعد اپنے پاس بلانے کی حکمتیں وہ خود ہی جانتا ہے' جو محدود انسانی عقل و شعور سے بالاتر ہیں۔ چنانچہ اس سلسلہ میں حضرت مولانا کے محب مخلص مولانا عبد الرحیم اشرف اور مولانا صدر الدین رفاعی کا خیال آیا جو ان کی طرح طویل علالت کے بعد دنیا سے رخصت ہوئے۔

مجھے یقین ہے کہ یورپ اور امریکہ کے معروف علمی تجسس کے نتیجہ کے طور پر مغربی یونیورسٹیوں میں عنقریب "تدبر قرآن" کی روشنی میں قرآن کریم پر جدید تحقیق و ریسرچ کا ایک نیا دور شروع ہو گا اور منجملہ دیگر فیوض و برکات کے بالخصوص قرآن کریم کی عبارت کے متعلق مستشرقین کے اعتراض "بے ربطی" کا مکمل اور مسکت جواب میسر آئے گا' تاہم میری ناقص رائے میں اس کیلئے ایک نہایت اہم مشکل اور ناگزیر شرط یہ ہے کہ اللہ کریم کسی جامع العلوم باصلاحیت دینی شخصیت کو "تدبر قرآن" کے انگریزی ترجمہ کی توفیق اور سعادت سے نوازیں۔ اگرچہ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ کام "تفہیم القرآن" کے انگریزی ترجمہ کی نسبت کہیں زیادہ مشکل اور محنت طلب ہو گا جو ڈاکٹر ظفر اسحاق انصاری صاحب نے بطریق احسن انجام دیا ہے' تاہم بحمد اللہ ہمارے ہاں بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی میں چند ایسے جید اور فاضل علماء موجود ہیں جنہیں اللہ کریم نے اس کی تکمیل و انجام دہی کی بھرپور علمی استعداد و صلاحیت سے نوازا ہے۔

علاوہ ازیں اس تیزی سے سمٹتی سکڑتی دنیا کے تناظر میں حضرت مولانا مرحوم کی دیگر تصانیف کا انگریزی ترجمہ بھی وقت کی اہم ضرورت اور دین کی بڑی خدمت ہے۔ حضرت مولانا کے رخصت ہونے سے برصغیر پاک و ہند کے دینی حلقوں میں ایک ایسا خلا پیدا ہو گیا ہے جو بڑی مشکل سے پر ہو گا کیونکہ "بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا"۔ میری دعا ہے کہ اللہ کریم ان کی خدمات جلیلہ اور صدقات جاریہ کو قبول فرمائیں' ان کے درجات بلند فرمائیں اور کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائیں۔

ڈاکٹر ابو سفیان اصلاحی

# ہمہ صفت شخصیت

مولانا امین احسن اصلاحی ۱۴ اور ۱۵ دسمبر ۱۹۹۷ء کی درمیانی شب میں اپنے معبود حقیقی سے جا ملے۔ (انا للہ وانا الیہ راجعون)۔ مولانا اصلاحی کی عظمت کیلئے صرف اتنا ہی کافی ہے کہ وہ "تدبر قرآن" کے مصنف ہیں اور یہ تفسیر دنیا کی تمام دیگر تفاسیر سے اس لئے منفرد ہے کہ اسے نظم قرآن کو مد نظر رکھتے ہوئے ترتیب دیا گیا ہے۔ اس تفسیر کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ مصنف نے افکار فراہی کا اسے نتیجہ بتایا ہے۔ مولانا ایک مفسر قرآن ہونے کے ساتھ ساتھ ایک کامیاب مترجم بھی تھے۔ انہوں نے مولانا فراہی کے کاموں کو اپنے تراجم سے متعارف کرایا۔ حدیث پر بھی مولانا کی اچھی نظر تھی۔ ادھر بہت دنوں سے انہوں نے درس حدیث کا سلسلہ شروع کیا تھا جسے ان کے تلامذہ ترتیب دیکر مجلہ "تدبر" میں شائع کیا کرتے ہیں۔ اس وقت ان کی ایک کتاب "مبادی تدبر حدیث" کے نام سے شائع ہو کر منظر عام پر آچکی ہے۔ فقہ بھی مولانا کے مطالعات کا ایک خاص جز تھا۔ اس سلسلہ میں ان کی کتاب "اسلامی ریاست" ایک جامع حیثیت کی حامل ہے۔ مولانا کے علمی پہلوؤں کی مختلف جہات ہیں۔ وہ ایک اچھے خطیب بھی تھے اور دعوت اسلام کے تعلق سے انہوں نے بے شمار خطبات و محاضرات دیئے۔ اراکین جماعت اسلامی ان کی دعوتی خدمات سے بخوبی واقف ہیں۔ مولانا مودودی انہیں اپنا دایاں بازو کہا کرتے تھے۔ یہ واقعہ ہے کہ جماعت کی تعمیر و تشکیل میں ان کا غیر معمولی حصہ ہے۔ انہوں نے عمر کا ایک طویل اور عزیز حصہ اس کے اغراض و مقاصد کی بازیافت کے لئے صرف کر دیا اور جماعت ہی کو پیش نظر رکھ کر انہوں نے مایہ ناز کتاب "دعوت دین اور اس کا طریقہ کار" کے لئے قلم اٹھایا۔ یہ کتاب اپنے موضوع پر منفرد حیثیت رکھتی ہے اور دعوت دین کے کام کرنے والوں کی آنکھوں کا سرمہ ہے۔

مولانا کی زندگی کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ وہ ہمیشہ صحافت کے میدان میں سرگرم عمل رہے۔ مدرسۃ الاصلاح سے فراغت کے بعد کچھ دنوں اخبار مدینہ بجنور سے وابستہ رہے۔ انہوں نے مدرسۃ الاصلاح سے مجلہ "الاصلاح" جاری کیا۔ یہ مجلہ خالص قرآنیات پر مبنی ہوتا۔ اس میں قرآنیات سے متعلق تحقیقی مقالات شائع ہوتے۔ خود مولانا قرآنیات کے مختلف گوشوں پر اظہار خیال کرتے اور مولانا فراہی کے تفسیری اجزاء کا ترجمہ بھی اس میں پیش کرتے۔ لیکن افسوس کہ یہ رسالہ چار سالہ مدت طے کرنے کے بعد بند ہو گیا جو علمی دنیا کے لئے ایک بہت بڑا نقصان تھا۔ مولانا نے پاکستان جانے کے بعد رسالہ "میثاق" جاری کیا۔ یہ رسالہ بھی قرآنیات کے لئے مخصوص تھا۔ لیکن افسوس کہ مولانا کو اس سے بھی اپنا تعلق ختم کرنا پڑا۔ اس وقت ان کی نگرانی میں رسالہ "تدبر" نکل رہا تھا کہ مولانا اپنے سفر آخرت پر روانہ ہو گئے لیکن توقع ہے کہ



ان کے تلامذہ اسے جاری و ساری رکھیں گے۔

مولانا کی زندگی کا ایک ممتاز پہلو یہ ہے کہ انہوں نے ہمیشہ خود کو اللہ کی کتاب سے جوڑے رکھا۔ قرآن کریم سے اس درجہ لگاؤ اور تعلق ان کے اندر اپنے استاد امام مولانا فراہی کی صحبت سے پیدا ہوا تھا جو قرآن کے ایک سچے عاشق تھے۔ دوسرا نمایاں پہلو یہ ہے کہ وہ فکر فراہی کی اشاعت سے ایک لمحہ بھی غافل نہ رہے۔ ہندوستان میں اس کی تشریح کے لئے دائرہ حمیدیہ کی بنیاد ڈال کر مولانا فراہی کی کئی کتابیں منظر عام پر لائی گئیں۔ مجلہ الاصلاح کا خاصا حصہ مولانا فراہی کے علمی کاموں کے لئے وقف کر دیا تھا۔ جماعت اسلامی میں رہتے ہوئے بھی وہ کبھی فکر فراہی سے غافل نہ رہے۔ ان کی تمام تحریریں قرآن ہی کو محور بنا کر مرتب ہوتی تھیں۔ اس کے علاوہ انہیں کی کوششوں کا ثمرہ ہے کہ اس وقت ادارۂ تدبر قرآن و حدیث قرآنیات کی تحقیق و تدریس میں مصروف و مشغول ہے۔ مولانا نے کچھ ایسے درخت لگا دئے ہیں جو قرآنیات کی دنیا میں ضرور محسوس کئے جائیں گے اور ثمر آور ہوں گے۔

مولانا کے انتقال پر ملال سے علمی دنیا میں ایک زبردست خلاء پیدا ہو گیا ہے۔ خدا ہمیں ان کا نعم البدل عطا کرے۔ ہندوستان میں بہت کم ایسے حضرات ہیں جنہوں نے مولانا کا دیدار کیا ہو۔ اللہ کا ہزار بار شکر ہے کہ میری ان سے متعدد ملاقاتیں رہیں کیونکہ 1985ء سے اب تک نہ جانے کتنے پھیرے پاکستان کے کئے۔ انہیں اپنے چھوٹوں اور بڑوں سے حد درجہ لگاؤ تھا۔ مجھے انہوں نے جس شفقت و محبت سے نوازا انہیں میں کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ انہیں جب بھی خط لکھتا تو اس کا جواب جناب خالد مسعود صاحب سے ضرور دلواتے۔ میں لاہور آنے کی جب انہیں اطلاع دیتا تو وہ کسی نہ کسی کو اسٹیشن بھیج کر اپنی کار سے مجھے منگواتے اور فرماتے کہ یہ تمہارا کمرہ ہے اور یہ تمہارے لئے کار ہے۔ تم جہاں چاہو آ جا سکتے ہو۔ اکثر ہوا کہ کئی کئی روز مولانا کی خدمت میں قیام رہا۔ دھوپ میں بیٹھ کر مستقل مدرسۃ الاصلاح، اپنے تلامذہ، اراکین جماعت اسلامی اور مولانا ابو اللیث اصلاحی ندوی، مولانا نجم الدین اصلاحی اور مولانا بدر الدین اصلاحی کے حالات دریافت کرتے۔ کبھی وہ دار المصنفین کے متعلق بھی دریافت کرتے اور ادارہ علوم القرآن کے رسالہ علوم القرآن کا خاص ذکر کرتے اور اس کی بقا کے لئے دعا کرتے۔ وہ ہندوستان آنے کے شدید خواہشمند تھے لیکن کہتے کہ اگر میں ہندوستان گیا تو دہلی ہی سے احباب، اعزاء اور دیگر تنظیموں کے سربراہوں کا اس قدر ہجوم ہو گا کہ ان کا سامنا کرنے کی مجھ میں اب تاب نہیں ہے۔ وہ مولانا فراہی سیمینار میں آنے کے بھی آرزومند تھے لیکن ان ساری حسرتوں کے ساتھ وہ اس دنیا سے دور چلے گئے۔

ایک مرتبہ لاہور آنے کی اطلاع میں نے مولانا کو بھی دی اور ساتھ ہی ساتھ مدیر نقوش جاوید طفیل صاحب کو بھی۔ جاوید صاحب مجھے اپنے گھر لے کر چلے گئے۔ شام کو جب جاوید صاحب کے ایک عزیز کے ساتھ مولانا سے ملنے گیا تو ان سے فرمایا۔ "آپ میرے مہمان کو اغوا کر کے لے گئے"۔ اس جملہ سے یہ

اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ کس قدر مہمان نواز تھے اور چھوٹوں سے کتنا مشفقانہ برتاؤ کیا کرتے تھے۔

ایک مرتبہ مولانا نے گفتگو کے درمیان بتایا کہ اسی جگہ صدر مرحوم ضیاء الحق تشریف لائے تھے اور انہوں نے مجھ سے یہ کہا کہ ہم لوگوں کی خواہش ہے کہ آپ ہفتہ میں کسی ایک دن ٹی وی پر درس قرآن دیا کریں۔ میں نے جواب دیا کہ میرے درس کے بعد رقص کا سلسلہ شروع ہو' میں ایسا درس دینے سے قاصر ہوں۔ ضیاء الحق صاحب کے مطالعہ میں "تدبر قرآن" مستقل رہا کرتی تھی۔

مولانا سے پہلی ملاقات میں میں ایک انٹرویو لینا چاہتا تھا۔ جب اس کے لئے درخواست کی تو انہوں نے یہ کہہ کر اجازت دے دی کہ چونکہ تمہارا تعلق مدرسۃ الاصلاح سے ہے اس لئے ان سوالات کے جواب دے رہا ہوں۔ یہ کیسٹ متعدد لوگوں نے مجھ سے مانگ کر سنا ہے۔ اس میں تمام سوالات قرآنیات' مولانا فراہی کی شخصیت اور مدرسۃ الاصلاح سے متعلق ہیں۔ مولانا کی ذات خود میں ایک ادارہ کی مانند تھی۔ ان کی رحلت سے علمی دنیا سوگوار ہے۔ اللہ سے دعا ہے کہ انہیں مغفرت عطا ہو اور خلد بریں میں جگہ نصیب ہو۔ اللہ تعالیٰ ان کے اعزاء اور متعلقین کو صبر جمیل کی دولت عطا فرمائے اور ہم سیاہ کاروں کو مولانا کے کاموں کو آگے بڑھانے کی توفیق دے۔

---


ادارہ تدبر قرآن کے زیر اہتمام

**درس قرآن**

ہر اتوار کی صبح 9.00 تا 10.00 بر مکان

جناب سعید احمد صاحب

9۔ وحدت روڈ لاہور ہوتا ہے۔

درس قرآن جناب خالد مسعود صاحب دیتے ہیں

ادارہ




عبدالرشید عراقی

# بیدار مغز عالم دین

مولانا امین احسن اصلاحی کے انتقال سے لاہور کے ان علماء کی بساط خالی ہو گئی ہے جو حرکت و عمل' دعوت و عزیمت' درد و کرب' ایثار و قربانی اور فکر و خیال کی اپنی طویل اور حسین تاریخ رکھتے تھے۔ مولانا امین احسن نہ صرف ایک عالم دین بلکہ برصغیر میں تفسیر' حدیث اور فقہ میں ایک ممتاز حیثیت کے حامل تھے۔ انہوں نے اپنے فکر و شعور سے الجھتے ہوئے مسائل کی گتھیاں سلجھائیں۔

مولانا امین احسن اصلاحی کم گو' فعال' سنجیدہ' مگر سرگرم اور نبض شناس تھے۔ ان کی پیشانی کی شکنیں ہمہ وقت معنی خیز نتائج کی متلاشی ہوتی تھیں۔ وہ ۱۷ سال تک جماعت اسلامی سے وابستہ رہے اور ہر نازک موقعہ پر جماعت اسلامی کی عظمت و وقار کے لئے سینہ سپر رہے۔ ان کی اصابت رائے کا یہ عالم تھا کہ مولانا مودودیؒ اور ارکان جماعت اسلامی ان کے مشوروں کی قدر کرتے تھے۔

سنجیدگی کے ساتھ بے باکی اور صاف گوئی مولانا امین احسن اصلاحی کا امتیاز تھا۔ ماچھی گوٹھ کے اجتماع میں جب مولانا مودودی سے اختلاف ہوا تو آپ نے برملا مولانا مودودی پر تنقید کی۔ پروفیسر حکیم عنایت اللہ نسیم سوہدری مرحوم نے' جو جماعت اسلامی سے کئی سال تک وابستہ رہے اور ماچھی گوٹھ کے اجتماع کے بعد جماعت اسلامی سے علیحدہ ہوئے' مجھ سے کئی بار اس بات کا تذکرہ کیا کہ:

> جب مولانا مودودی مرحوم نے امارت سے اپنا استعفیٰ پیش کیا تو مولانا امین احسن اصلاحی ایک دم غصے میں آ گئے اور مولانا مودودی سے فرمایا۔ ہم آپ کو بھاگنے نہیں دیں گے۔ یہ پھولوں کی سیج نہیں ہے۔ کانٹوں کی مالا ہے۔ ہم آپ کو گریبان سے پکڑیں گے۔ اگر اس راہ پر آپ چل نہیں سکتے تھے تو جماعت اسلامی کی بنیاد کیوں رکھی؟

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ مولانا اصلاحی ذہانت و ذکاوت اور بیدار دماغی میں ممتاز اور بڑا بلند مقام رکھتے تھے۔ تعلیم سے فراغت کے بعد اپنے مادر علمی مدرسۃ الاصلاح میں مسند درس و تدریس پر فائز ہوئے۔ انہوں نے مولانا حمید الدین فراہی سے علوم قرآنی اور امام حدیث مولانا عبد الرحمان مبارکپوری سے حدیث میں استفادہ کیا۔ ہر ان دو علوم میں ان کی نظر وسیع اور گہری ہوتی چلی گئی۔ انہوں نے ان علوم میں محنت کی۔ اور اہل علم میں ان علوم میں ان کی مہارت تامہ کی خاصی شہرت ہوئی۔

مولانا امین احسن قدرت کی طرف سے بڑے اچھے دل و دماغ لے کر پیدا ہوئے تھے۔ روشن فکر' دردمند دل' اور سلجھا ہوا دماغ پایا تھا۔ ذہانت و ذکاوت کے ساتھ قوت حافظہ بھی بہت قوی تھی۔ ٹھوس اور قیمتی مطالعہ ان کا سرمایہ علم تھا۔ ملکی سیاسیات سے نہ صرف باخبر تھے بلکہ اس پر اپنی ناقدانہ رائے بھی رکھتے

تھے۔ سیاسی اور غیر سیاسی تحریکات کے پس منظر سے پوری طرح باخبر تھے۔ ادب عربی کا بہت اعلیٰ اور ستھرا مذاق رکھتے تھے۔ لغت اور قواعد پر ان کی گہری نظر تھی اور اس کی باریکیوں کے مبصر تھے۔ الفاظ کی تحقیق میں مہارت رکھتے تھے۔ وہ عربی اور اردو کے بلند پایہ اور فطری انشاء پرداز تھے۔ قلم برداشتہ تحریر کا ان کو عجیب ملکہ حاصل تھا۔ تحریر میں برجستگی، سلاست اور روانی ہوتی تھی۔ مولانا مرحوم کی تحریر کی خاص خوبی یہ تھی کہ حشو و زوائد سے پاک ہوتی تھی۔

مولانا امین احسن اصلاحی کا سب سے بڑا علمی کارنامہ ان کی تفسیر تدبر قرآن ہے۔ یہ تفسیر ایک ممتاز مقام کی حامل ہے اور اہل علم و قلم نے اس کی تعریف و توصیف کی ہے۔ اس کے علاوہ مولانا اصلاحی مرحوم نے دوسری جو کتابیں لکھی ہیں ان کی بھی علمی دنیا میں خاصی پذیرائی ہوئی ہے۔

راقم سے ایک ملاقات میں فرمایا تھا کہ اب میری خواہش ہے کہ حقیقت معاد پر ایک کتاب لکھوں۔ تفسیر سے فراغت کے بعد اس طرف توجہ دوں گا۔ لیکن تفسیر سے فراغت کے بعد ان کی توجہ دوسرے اہم کام تدبر حدیث کی طرف ہو گئی جس پر انہوں نے خاصا وقیع علمی سرمایہ چھوڑا ہے۔

مولانا امین احسن انتہائی منکسر المزاج، دور اندیش اور تعمیری فکر رکھنے والے انسان تھے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ مولانا مرحوم کی لغزشوں سے درگزر فرمائے۔ اور علیین میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ ؎

داغ فراق صحبت شب کی جلی ہوئی
اک شمع رہ گئی تھی سو وہ بھی خموش ہے

---

بقیہ صفحہ 79 سے آگے

زور سے اپنے دانتوں کو رگڑتے رہے۔ شاید انہیں دانتوں میں تکلیف محسوس ہو رہی تھی۔ ڈاکٹر شہباز کہنے لگے کہ شاید انہیں اس طرح کرنے سے سکون ملتا ہو۔ بڑھاپے اور بیماری کی وجہ سے مولانا کے ہاتھ کی انگلیاں جڑ سی گئی ہیں۔

**۱۲ اکتوبر ۹۷ء**

مولانا نے جب ساتھیوں کو دیکھا تو بڑی مشکل سے فقط ----- آ-------پ --- !!! ہی کہہ سکے۔ کسی نے ملازم سے پوچھا کہ مولانا کھانے پینے میں ضد تو نہیں کرتے۔ ملازم نے جواب دیا کہ جب بھی مولانا سے پوچھا جاتا ہے کہ وہ کیا کھائیں گے تو وہ بس یہی جواب دیتے ہیں "جو مل جائے"۔

مولانا کے پاس ہم آدھا گھنٹہ بیٹھے رہے۔



عبدالحمید برایشق

# متوازن و معتدل عالم

مجھے مفسر قرآن مولانا امین احسن اصلاحیؒ کے انتقال کی خبر سن کر بہت دکھ ہوا۔ یہ ایک ظاہر بات ہے کہ مولانا اصلاحی سے میرا نسبی یا خاندانی تعلق کچھ بھی نہیں تھا۔ میں ترکی کا باشندہ ہوں اور ان کا تعلق پاکستان سے تھا۔ اس کے باوجود مولانا سے میرا رشتہ قلبی، حسی اور فکری ہے، اور یہی اصل رشتہ ہوتا ہے۔

میں اردو تفاسیر کے بارے میں تحقیق کی غرض سے پاکستان گیا اور جو چند تفاسیر میں نے بحث کے لیے منتخب کیں ان میں تفسیر تدبر قرآن بھی شامل تھی۔ چنانچہ جنوری ۱۹۹۳ء میں تفسیر پر گفتگو کرنے کے لیے مولانا سے ان کی قیام گاہ پر ملنے جاتا رہا۔ اس وقت مولانا بہت مشکل سے سنتے تھے۔ لہٰذا میں نے سوالات لکھ کر دیے اور مولانا نے بڑی تفصیل سے ان کے جوابات دیے۔ یہ جوابات مدلل بھی تھے، معقول بھی اور معتدل بھی۔ بیک وقت یہ تین چیزیں برصغیر پاک و ہند کے علماء میں مشکل ہی سے جمع ہوتی ہیں۔ مولانا کے اس پہلو نے مجھے بے حد متاثر کیا۔ میں ان کی کتابیں اپنے ساتھ ترکی لایا اور ان کو بڑے غور سے پڑھا۔ میں نے دیکھا کہ اعتدال ہی ان کا اصل مزاج اور سرمایہ ہے اور وہ اپنی بات نہایت مدلل طور پر پیش کرتے ہیں۔

میرے خیال میں عالم اسلام کے مسلمانوں کا عموماً، اور برصغیر کے مسلمانوں کا خصوصاً، ایک اہم مسئلہ فرقہ بندی ہے۔ اپنے فرقہ کی خاطر لوگ صحیح کو غلط اور غلط کو صحیح بنا دیتے ہیں۔ یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک فرقہ یا جماعت کی بزرگ شخصیات اپنے فرقہ کے لیے بت بن جاتی ہیں اور اس فرقہ کے علماء اور پڑھے لکھے اشخاص اپنا وقت ان کے فضائل لکھنے میں ضائع کر دیتے ہیں۔ ہر جماعت دوسری جماعت کے ساتھ اس بارہ میں مقابلہ اور مسابقت کرتی ہے۔ وہ اپنے بزرگوں کے لیے زیادہ سے زیادہ شاندار الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ یہ طرز عمل کسی طرح بھی صحیح نہیں قرار دیا جا سکتا۔ جماعت کا وجود اور جماعت کے بزرگوں کا احترام ہونا ایک اچھی بات ہے، لیکن اس میں ایک توازن اور مدح کی ایک حد ہونی چاہیے۔ مولانا اصلاحی کے اندر میں نے اس توازن اور اعتدال کا مشاہدہ کیا۔ وہ کہیں کہیں اپنی علمی تحقیق کی رو سے اپنے استاذ یا کسی قریبی دوست سے بھی اختلاف رائے کا اظہار کر دیتے۔ اگر برصغیر کے تمام علماء میں یہ خصوصیت پیدا ہو جائے تو معاشرہ میں ان کا مرتبہ اور مقام بے حد اونچا ہو سکتا ہے۔

صحیح اسلامی معاشرہ میں علم اور عالم کا رتبہ بہت اونچا ہے۔ **رتبة العلم اعلى الرتب**۔ عالم کو کسی دنیاوی منفعت کے لیے اس کی بے قدری کرنے کا حق حاصل نہیں۔ اگر وہ ایسا کرتا ہے تو **يشترون بآيات الله ثمنا قليلا** (وہ اللہ کی آیات کا حقیر پونجی کے عوض سودا کرتے ہیں) کا مصداق بن جاتا ہے۔

جب میں پاکستان میں تھا تو اس دوران حکومت چار مرتبہ تبدیل ہوئی۔ ان تبدیلیوں میں کچھ بڑے بڑے عالموں (؟) نے معمولی منفعت کی خاطر ایسے لوگوں کا ساتھ دیا جن سے ملک، ملت اور دین اسلام کو کبھی فائدہ نہیں ہو سکتا۔ مجھے معلوم ہوا کہ مولانا اصلاحی نے اس طرح کی کمزوری بھی کبھی نہیں دکھائی۔ میری معلومات کے مطابق جماعت اسلامی سے ان کی علیحدگی نظم جماعت میں مشاورت کے اصول پر ہوئی۔ جب ایک معاشرہ مشاورت کو حقیقی اہمیت نہ دے تو وہ کبھی ترقی نہیں کر سکتا۔

مولانا اصلاحی رحمتہ اللہ علیہ نے میری درخواست پر مجھے اپنی شاہکار تفسیر تدبر قرآن کے ترکی ترجمہ کی اجازت دی۔ یہ میرے لیے بڑے شرف کی بات ہے۔ لیکن یہ مولانا کی تنقید میں مانع نہیں۔ اگر ان کی کوئی غلطی میری نظر سے گزری تو اس پر علمی انداز سے تنقید کروں گا۔ اللہ کا شکر ہے اب تک کے مطالعہ میں ایسا کوئی موضوع سامنے نہیں آیا۔

مولانا اصلاحی رحمتہ اللہ علیہ علمی اخلاق، علمی عمق، سیاسی کردار اور انسانی سلوک کے لحاظ سے اچھے الفاظ میں ذکر کرنے اور یاد کرنے کے لائق انسان تھے۔ اللہ تعالیٰ ان کی بشری غلطیوں کو معاف فرمائے اور ان کو جنت نعیم میں مقام عطا فرمائے۔ (آمین)

---

بقیہ صفحہ 58 سے آگے

ہمارے فرائض و واجبات میں سے ہے۔ آج تک اس ملت کے اندر جتنی جماعتیں بنی ہیں انہوں نے درحقیقت جسد ملت سے گوشت کا ایک ٹکڑا کاٹا ہے اور اپنی دوکان، جسے وہ اپنی جماعت کہتے ہیں، بنالی ہے۔ پھر ملت سے بالکل بے پروا ہو کر اپنی اسی دوکان کو چلانا چاہتے ہیں۔ مجھے جماعت اسلامی میں شامل ہونے کے بعد یہ احساس ہوا کہ جماعت بنانا اور پھر اس کے ذریعہ سے ملت کی خدمت کرنا نہایت مشکل کام ہے اور ہر ایک کا یہ ظرف بھی نہیں ہے۔ لوگ جماعتیں بناتے ہیں، پھر ملت کی خدمت کی بجائے اپنی جماعت ہی کی خدمت مد نظر رکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ جماعتیں ملت کے لیے فائدہ مند ہونے کی بجائے اس کے لیے فتنہ بن جاتی ہیں۔ اس لیے میری رائے یہ ہے کہ یہ کام فائدہ مند نہیں بلکہ خطرناک اور مہلک ہے۔ کسی جماعت کے کڑے ڈسپلن میں جکڑ کر اس کے مخصوص اغراض کے لیے استعمال ہونے سے بہتر ہے کہ آپ پوری ملت کو پیش نظر رکھ کر اس کی خدمت کریں۔ اپنی صلاحیت کے مطابق جو بھی مذہبی، سیاسی یا تعلیمی کام کیا جا سکتا ہے، اسے کرنا چاہیے۔ یہی ہمارا دینی فرض ہے اور بس اتنا ہی ہم پر واجب ہے۔

---



عبدالخالق فاروقی

# بحر زخار کا غواص

یہ حسن اتفاق ہے کہ 1980ء کے رمضان المبارک کے عشرہ اخیرہ میں میں اپنے گاؤں کی مسجد میں معتکف تھا کہ مبارک راتوں میں سے ایک رات کو مجھے "تدبر" کا پہلا شمارہ بطور تحفہ موصول ہوا۔ پڑھ کر دل کی کیفیت بدل گئی۔ فکر فراہی اور کتب اصلاحی کے مطالعہ کا شوق پیدا ہوا۔ جوں جوں مطالعہ بڑھتا گیا اس مکتب فکر سے وابستگی بڑھتی چلی گئی۔ مولانا اصلاحی سے ملاقات کا جنون پیدا ہونے لگا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے لئے تقریب پیدا کر دی۔ 1983ء میں ایک کورس کے سلسلہ میں چند ماہ لاہور میں رہنا پڑا۔ اس موقع کو مولانا سے ملاقات کے لیے غنیمت جانا! اس زمانے میں وہ جامعہ اشرفیہ کے قریب فاضلیہ کالونی کی ایک کوٹھی میں درس قرآن دیتے تھے۔ پہلا درس جو سنا وہ سورہ آل عمران کا آخری رکوع تھا۔ قرآنی علم و حکمت کا ایک سمندر موجزن تھا۔ معارف قرآن کے موتی بکھر رہے تھے۔ درس کے دوران میں فرمایا کہ ذکر اصل میں وہ ہے جو تفکر کا نتیجہ ہو۔ جو لوگ آنکھیں بند کر کے تفکر سے عاری ہو ہو کی رٹ لگاتے ہیں وہ ذکر کی روح سے ناآشنا ہیں۔ تخلیق کائنات کی بوقلمونی پر غور و فکر کرنے والے پر فی الحقیقت خدا کی عظمت و جلالت اور قدرت و ربوبیت کی شان ظاہر ہوتی ہے اور خدا کی کبریائی سے ڈر کر اس میں خوف آخرت پیدا ہو جاتا ہے۔ یہی اصلی ذکر ہے۔

اس کے بعد مولانا کے درس کا ایسا چسکا پڑا کہ دوسرے کاموں کو ثانوی درجہ میں رکھ کر درس میں باقاعدگی سے حاضری دیتا۔ سورہ نساء کے کئی رکوعوں کا درس سنا۔ یہ سلسلہ قریباً تین ماہ تک جاری رہا۔ کورس کی تکمیل پر لاہور سے واپس آنا پڑا تو مولانا کی شخصیت اور ان کے درس سے مفارقت بڑی شاق گزری۔ ملازمت اور گھر کی مجبوریوں کی بناء پر خواہش کے باوجود لاہور منتقل نہ ہو سکا۔ لیکن جب کبھی لاہور آنا ہوتا تو مولانا اصلاحی کا درس بطور خاص پروگرام کے شیڈول میں ہوتا۔ اس طرح 1993ء تک طویل اور قلیل وقفوں کے ساتھ درس میں شرکت کی سعادت سے بہرہ مند ہوتا رہا۔ مولانا کی تصانیف کا مستقل قاری ہونے کی وجہ سے ان کے درس کی لذت بیان سے باہر تھی۔ دوران درس میری تمنا ہوتی کہ کاش وقت کی رفتار رک جائے اور سرود ربانی کی یہ محفل ختم ہونے میں نہ آئے۔

مولانا کے درس کا انداز وہی تھا جو فکر فراہی اور تفسیر تدبر قرآن کا ہے۔ عمود، سیاق و سباق، نظم کلام، مماثل نظائر قرآن، اصل عربی زبان کا تتبع۔ بلا مبالغہ درس کے دوران میں یوں محسوس ہوتا کہ مولانا بحر قرآن میں غوطہ زن ہیں اور قرآنی گوہر اور موتی نکال نکال کر سامعین میں بانٹ رہے ہیں۔ ان کے دروس کا مجھے بے پناہ فائدہ ہوا۔ مطالعہ قرآن کا ذوق بڑھا، ان کی طرز پر سوچ پیدا ہوئی۔ اس وقت صورت حال یہ

ہے کہ قرآن میں تدبر و تفکر گویا زندگی کا نصب العین بن چکا ہے۔ قرآن فہمی کے راستے ہموار ہو رہے ہیں اور اس نہج پر خود درس قرآن دیتا ہوں۔

دروس میں شرکت کے علاوہ میں نے مولانا امین احسن اصلاحی ؒ سے متعدد ذاتی ملاقاتیں بھی کی ہیں۔ مولانا کے در دولت پر حاضر ہو کر ملاقات کی درخواست کے لیے پیغام بھیجتا تو مولانا بلا تاخیر شرف باریابی سے نوازتے، بہت شفقت فرماتے اور بسا اوقات اپنے علو مرتبت سے نیچے اتر کر عزت و تکریم سے پیش آتے۔ بعض اوقات تواضع بھی کرتے۔ ایسی شفقت اور اکرام حنیف بلاشبہ ان کے عظیم کردار کا حصہ تھا۔

مولانا کی طبیعت میں متانت کے ساتھ ساتھ لطیف مزاح اور خوش مذاقی کا عنصر بھی بدرجہ اتم موجود تھا۔ ان کے بعض جملے سامعین کو لوٹ پوٹ کر دیتے تھے۔ اردو ادب و زبان تو گویا ان کے گھر کی لونڈی تھی۔ ایک مرتبہ درس کے دوران میں حسب موقع غالب کا ایک شعر زبان پر آگیا تو اس پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا "ظالم بعض شعر ایسے کہتا ہے گویا آسمان سے اترے ہوئے ہیں"۔

فراہی اور اصلاحی مکتب فکر میں قرآن فہمی کے لئے اس عربی زبان کی مہارت ضروری ہے جو نزول قرآن کے وقت قریش کی ٹکسالی زبان تھی اور اس کا بیشتر حصہ جاہلی ادب کے دواوین میں مدفون ہے۔ ایک مرتبہ مولانا نے فرمایا "قرآن کی عربی تو وہ ہے کہ جب تک چربی نہ گھلا دی جائے نہیں آتی"۔ پھر اپنے استاذ امام حمید الدین فراہی ؒ کی عربی دانی کے متعلق فرمایا کہ وہ عربی الفاظ کا شجرۂ نسب تک جانتے تھے۔

تفسیر تدبر قرآن مولانا امین احسن اصلاحی ؒ کا عظیم الشان کارنامہ ہے۔ اسے بجا طور پر بیسویں صدی عیسوی کا معجزہ کہا جا سکتا ہے۔ اس کا سائنٹفک انداز اصحاب علم و فکر کی توجہ کا مرکز بنتا جا رہا ہے۔ آنے والے زمانہ میں قرآن کی ریسرچ کرنے والا کوئی بھی طالب علم اس تفسیر سے بے نیاز نہیں ہو سکے گا۔ ایک دفعہ میں مولانا کی ملاقات کے لئے حاضر ہوا تو پنسل اور کاغذ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ کوئی سوال ہو تو لکھ کر دو۔ میں نے لکھا۔

"اس وقت آپ کے پاس بیٹھے ہوئے مجھے کوئی سوال پوچھنے کی استعداد گویا ختم ہو گئی ہے۔ میں آپ کی تفسیر تدبر قرآن کا مطالعہ کر رہا ہوں۔ خواہش ہوتی ہے کہ تفسیر پڑھتے ہوئے تنہائی ہو اور بس"۔

یہ پڑھ کر مولانا نے فرمایا "تم نے میری تفسیر پر تبصرہ تو کر دیا ہے۔ جب میں نے تفسیر لکھنے کا آغاز کیا تھا تو میرا خیال یہ تھا کہ اسے زیادہ پذیرائی حاصل نہیں ہو گی لیکن میں حیران ہوں کہ یہ دھڑا دھڑ مقبول ہو رہی ہے"۔

اگرچہ مولانا اصلاحی کی جملہ تصانیف فہم دین اور فہم قرآن کے لئے "مرشد کامل" کا حکم رکھتی ہیں لیکن تین کتابوں سے میں بے حد متاثر ہوں۔ تزکیہ نفس، فلسفے کے بنیادی مسائل قرآن حکیم کی روشنی میں اور تفسیر تدبر قرآن۔ پہلی دو کتابوں کا متعدد مرتبہ مطالعہ کر چکا ہوں لیکن طبیعت سیر نہیں ہوتی۔ تفسیر تدبر



قرآن ایک بحر ذخار ہے اور اپنی استعداد کے موافق اس سے علمی اور ایمانی پیاس بجھا رہا ہوں۔

مجھے اس بات پر فخر اور مسرت کا احساس ہے کہ اب میں فراہی اور اصلاحی مکتب فکر کا ایک ادنیٰ طالب علم ہوں۔

---

بقیہ صفحہ 38 سے آگے

قرآن مجید کی متعدد آیات میں کہا گیا ہے کہ خدا جس کو چاہتا ہے اس کو عزت دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے ذلت دیتا ہے، یا خدا جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے اور جس کو چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے۔ اس قسم کی آیات سے جبریت کے حامیوں نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ انسان اپنے کسی فعل میں آزاد نہیں ہے۔ مولانا کے نزدیک ان لوگوں نے ان آیات کو تو لے لیا ہے اور دوسری آیات کو چھوڑ دیا ہے جن میں گمراہی یا نیک عمل کے اسباب بیان کئے گئے ہیں۔ مولانا کے نزدیک خدا کا چاہنا اس کی مشیت کے تابع ہے۔ خداوند تعالیٰ کی مشیت عالمگیر اور ہر چیز پر حاوی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ مطلق نہیں بلکہ مقید بالحکمت ہے یعنی خدا کی مشیت حکمت اور عدل و انصاف پر مبنی ہے۔

مولانا نے یہ بات واضح کی ہے کہ نیکی و بدی اور خیر و شر کے معاملہ میں ہمیں آزادی حاصل ہے لیکن یہ آزادی اور اختیار غیر محدود اور غیر مشروط نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کی حکمت و مصلحت کا تقاضا ہو تو ہو سکتا ہے کہ وہ ہمارے کسی نیک سے نیک ارادہ کو پورا ہونے سے روک دے یا ہمارے برے سے برے فعل کو بھی ڈھیل دے دے۔ لیکن اگر اللہ تعالیٰ کسی نیک ارادے کو پورا ہونے نہیں دے گا تو بندے کو اس کی جزا سے محروم نہیں کرے گا۔ اسی طرح اگر اس نے برے ارادہ کو پورا ہونے سے روک دیا تو آدمی اس فعل بد کے وبال سے نہیں بچ سکے گا۔ قرآن مجید کے اس ضابطہ کا اطلاق اسی صورت میں ہوتا ہے جب آپ کسی فعل کو کرنے کا مصمم عزم رکھتے ہوں۔ ویسے دل میں نہ جانے کتنے وسوسے اور خیالات آتے رہتے ہیں جن کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ اصل چیز مصمم ارادہ ہے۔

فلسفہ میں مولانا کا غور و فکر کا طریقہ یہ تھا کہ وہ پہلے قرآن مجید کی روشنی میں کوئی اصول قائم کرتے اور اس پر برابر غور کرتے رہتے۔ جب انہیں اطمینان ہو جاتا کہ اصول درست ہے تو وہ اس کی روشنی میں فلسفیوں کی رائے پر غور کرتے اور ان کی خامیوں اور خوبیوں کو بیان کرتے۔ اسی طریقہ فکر سے مولانا نے خیر و شر، جبر و اختیار اور دوسرے الجھے ہوئے اور کٹھن سوالات کے جوابات معلوم کئے اور صدیوں سے جو مسائل حل نہیں ہو سکے تھے انہیں قرآن حکیم کی روشنی میں حل کیا۔

---

محمد محمود احمد لودھی

# شفیق استاذ

مولانا اصلاحی کی خدمت میں پہلی مرتبہ 1951ء میں اس وقت حاضر ہوا جب وہ راج گڑھ میں رہا کرتے تھے۔ دسمبر 1951ء میں پہلی مرتبہ ان سے قرآن اور تزکیہ نفس پر ایک تربیت گاہ میں درس لئے۔ اس کے بعد ایک اور تربیت گاہ میں بھی اصلاحی صاحب سے انہی مضامین پر درس لیا۔ مولانا اصلاحی ؒ سے باقاعدہ تلمذ البتہ 1962ء سے شروع ہوا جب انہوں نے حلقہ تدبر قرآن کی داغ بیل ڈالی۔ یہ سلسلہ 1965ء تک جاری رہا۔ اس کے بعد میں تین سال کے لئے ڈھاکہ (مشرقی پاکستان) منتقل ہو گیا۔ وہاں پہنچنے کے بعد مولانا سے خط و کتابت کا سلسلہ جاری رہا اور میں اپنے مطالعہ کے لیے ان کے خطوط سے رہنمائی لیتا رہا۔

مولانا اصلاحی اکثر کہا کرتے تھے کہ "میں نے استاد (مولانا حمید الدین فراہی ؒ) سے چند اصول سیکھے تھے لیکن کسی آیت یا مجموعہ آیات کے بارے میں متعین طور پر یہ نہیں بتا سکتا کہ مولانا فراہی ؒ کی رائے کیا تھی"۔ مولانا فراہی ؒ کی تفسیر کے بعض اجزاء تو خود مولانا اصلاحی ؒ کے ترجمے کے ساتھ 'باستثناء سورۂ اخلاص' چھپ چکے ہیں لیکن غیر مطبوعہ کتابوں' اور خاص طور پر قرآن مجید پر 'مولانا فراہی ؒ کے تفسیری نکات اور یادداشتوں کے بارے میں اصلاحی صاحب ناپسند کرتے تھے کہ غیر ذمہ دار طالب علموں کی ان تک رسائی ہو۔

اصلاحی صاحب نے تفسیر تدبر قرآن میں کہیں کہیں مولانا فراہی ؒ سے اختلاف کیا ہے۔ ان کے نزدیک خود "استاذ" کے اصولوں کے مطابق کسی آیت کی تاویل ان کی اختیار کردہ تاویل سے زیادہ خوبصورت انداز میں کی جا سکتی تھی۔

مولانا اصلاحی نے تفسیر میں جن بنیادی اصولوں کی پاسداری کی ہے ان میں قرآن میں نظم کلام اور محکم نظام سے کامل وابستگی' قرآن کے اجمال کی تاویل قرآن ہی میں موجود دوسرے مقام کی تفصیل کی مدد سے کرنا' قرآن کی زبان کو معروف ماننا اور الفاظ کے شاذ معانی سے اجتناب' معروف قرات کے مقابلہ میں شاذ اور غیر معروف روایتوں کو نظرانداز کرنا' وغیرہ شامل ہیں۔ ان اصولوں سے انحراف کی انہیں حاجت نصیب نہیں ہوئی۔ مولانا نے جو نئی تحقیق پیش کی ہے اس میں مکی اور مدنی سورتوں کے ساتھ گروپوں میں قرآن کا سلسلات مضمونوں کا حامل ہونا' ان میں سورتوں کا جوڑے جوڑے ہونا اور توام سورتوں کا باہم گر مربوط اور ہم مضمون ہونا ثابت کیا ہے۔ وہ یہ تو بتا دیتے ہیں کہ کسی سورہ کا عمود یا مرکزی مضمون کیا ہے اور اس کا اپنی توام سورہ سے کیا ربط اور گروپ کی بقیہ سورتوں سے کیا تعلق ہے اور اس میں مضمون کا درجہ بدرجہ ارتقاء



کس طرح ہوا ہے' لیکن یہ انکشاف نہیں کرتے کہ خود ان پر یہ عمود درجہ بدرجہ منکشف کیوں کر ہوا۔ مثلاً ابتداء میں انہیں پوری سورۃ ایک خاص مرکزی مضمون پر منظم نظر آئی' پھر اس سے بہتر مرکزی مضمون دریافت ہوا تو فکر و تدبر کے پہلے دور میں متعین کردہ عمود میں کمزوری کے پہلو کیا تھے۔

انہوں نے کہیں کہیں مفسروں اور مترجموں کے نقطہ نظر کی خامی پر بحث کی ہے' اگرچہ بیشتر وہ اپنی بات پوری قوت کے ساتھ بیان کر دیتے ہیں اور استاذ ؒ کی طرح دوسروں کی تاویل پر نہ تنقید ہی کرتے ہیں اور نہ ان کا عذر ہی بیان کرتے ہیں۔ یہ کام انہوں نے غالباً بعد میں آنے والوں پر چھوڑ دیا ہے۔

کمزور تفسیری روایات سے جہاں کہیں انہوں نے تعرض کیا ہے وہاں ان کی کمزوری نمایاں کر دی ہے۔ بقیہ ذخیرۂ احادیث اور خاص طور پر فقہ اور قانون سے متعلق روایات اور اخبار احاد کو انہوں نے قرآن مجید سے اور معروف و مشہور روایات سے تطبیق دینے کی ایک کامیاب کوشش کی ہے۔

جب کبھی مولانا مودودی ؒ اور جماعت اسلامی کا ذکر چھڑ جاتا تو مولانا اکثر اپنا اختلاف بڑی جزرسی سے بتا دیا کرتے تھے۔ وہ جماعتی احباب میں میاں طفیل محمد صاحب کے اخلاص اور وفاکیشی کے مداح تھے۔ بعض احباب سے ان کو شکایت تھی کہ وہ مولانا مودودی کے وفادار ضرور تھے لیکن خود سوچ سمجھ کر کوئی رائے قائم کرنے کے عادی نہ تھے۔ جماعت اسلامی سے وابستگی کے دور میں انہوں نے مولانا مودودی ؒ کے دفاع میں جو کچھ لکھا اس کے حوالہ سے ایک مرتبہ کسی نے مولانا مودودی کی علمیت کے بارے میں سوال کر دیا تو مولانا کا جواب یہ تھا کہ "مولانا مودودی نے کیا پڑھا ہے اور کہاں تک پڑھا ہے یہ تو مجھے نہیں معلوم مگر وہ قرآن کو بقدر نصاب پڑھنے یا دورۂ حدیث پر اکتفا کرنے کے قائل نہ تھے بلکہ لفظ لفظ پر ایک اسکالر کی طرح غور کرنے والے تھے"۔ اس سے ان کے پیش نظر مولانا مودودی کی مدح سرائی تھی یا ان کے ناقدین کا استخفاف مقصود تھا؟ اس کا تعین کرنا مشکل ہے لیکن اس تبصرہ میں ان لٹھ بازوں پر چوٹ ضرور تھی جو تعلیم و تعلم' ریسرچ اور تحقیق' اور اسکالرشپ سے بے نیاز لیکن خدمت قرآن و حدیث کا علم اٹھائے ہوئے تھے۔

جماعت اسلامی کے ساتھ مولانا کی رفاقت کے سترہ سال علمی کاموں کے لحاظ سے تو کچھ زیادہ بار آور نہ رہے تھے لیکن میں نے کبھی انہیں اس پر متاسف نہیں دیکھا۔ وہ کہا کرتے تھے کہ شوریٰ میں وہ دلیل اور حکمت سے اپنے ساتھیوں کو ہم رائے اور قائل کر لیا کرتے تھے اور مولانا مودودی ؒ کو مطلق العنانی سے روک دیتے تھے۔ 1951ء کے صوبائی انتخاب میں ان کی شرکت بلکہ ایک حلقے سے بطور امیدوار کھڑے ہونے اور اپنی ناکامی کے بارے میں وہ کہا کرتے تھے کہ مولانا مودودی کی حکمت نے خود انہیں تو انتخابی اکھاڑے میں اترنے سے باز رکھا لیکن مجھے میری مخالفت اور بے دلی کے باوجود اس میں جھونک دیا۔ انتخابی سیاست اور اس کے مزعومہ ثمرات سے ان کو کوئی خاص دل بستگی نہ تھی۔

اپنے شاگردوں سے دل بستگی اور ان کے حال پر شفقت اس درجے کی تھی کہ ہر شاگرد بجا طور پر ان کا چہیتا شاگرد ہونے کا دعویٰ کر سکتا تھا۔ ہمارے درس کے ایک ساتھی شیخ محمد صادق صاحب کو ایک شیخ وقت سے عقیدت ہو چلی تھی۔ اصلاحی صاحب انہیں ٹوکا کرتے تھے "دیکھنا کہیں ان کی بیعت نہ کر بیٹھنا"۔ شیخ صاحب بالآخر باز نہ رہ سکے اور بیعت کر ڈالی۔ حلقے کے درس میں ہمارے ایک ساتھی سلیم کیانی صاحب جماعت اسلامی کے رکن تھے۔ مولانا کو ان کا پاس خاطر ملحوظ رہتا تھا۔ ان کی آزردگی اور دل آزاری کے مدنظر وہ درس کے دوران جماعت اسلامی پر مشکل ہی سے کوئی چوٹ کرتے تھے' البتہ میں چھیڑ خانی کر دیتا اور جماعت اسلامی کے حق میں کوئی کلمہ خیر شرارتاً کہہ دیا کرتا۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ مجھے مولانا کی ڈانٹ سننی پڑتی۔ آج میں صرف اسی بات پر فخر کر سکتا ہوں کہ میں نے تمام ساتھیوں سے زیادہ استاد کی ڈانٹ کھائی ہے۔

## بیاد مولانا امین احسن اصلاحیؒ

اک مسند ارشاد "فراہی" نے بچھائی — اس مشعل اصلاح سے روشن تھی خدائی
اس میکدۂ علم کا "اصلاحی" امیں تھا — جس نے رہ تحقیق میں کی راہ نمائی
وہ پیکر اخلاص عمل' عظمت دیں تھا — اس نے سند علم کی توقیر بڑھائی
تا عمر رہا سنت علماء کا وہ محافظ — اس نے در جہال پہ گردن نہ جھکائی
ناموس قلم اس کا ہمیشہ رہا بے داغ — "خوش مصلحی" اس کی طبیعت کو نہ بھائی
حافظ کے تفاؤل سے ملا اس کا یہ پیغام — "اصلاحی" نے علماء کو نئی رمز بجھائی

"جاں می دہم از حسرت دیدار تو در صبح
باشد کہ چو خورشید درخشاں بدر آئی"

علامہ شبیر بخاری



مکاتیب قارئین

# بعض وضاحتیں

محترمی و مکرمی جناب خالد مسعود صاحب
مدیر تدبر' لاہور

السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ

جنوری ۱۹۹۸ء کے "تدبر" میں آپ نے مولانا امین احسن اصلاحی صاحب مرحوم و مغفور پر اپنے مضمون میں ان کی جماعت اسلامی میں شمولیت اور اس سے انقطاع کے سلسلے میں بالکل بلاضرورت و بلاوجہ بعض ایسی باتیں لکھ دی ہیں جن سے باہم بدمزگی کے سوا کچھ بھی حاصل نہیں ہو سکتا۔ مثلاً آپ فرماتے ہیں کہ مولانا اصلاحی صاحب کبھی جماعت اسلامی میں شامل نہیں ہوئے۔ وہ تو مولانا منظور احمد نعمانی صاحب نے اپنی طرف سے ان کا نام جماعت کے ارکان میں شامل کرا دیا اور مولانا اصلاحی صاحب نے گویا مروۃً اس کی تردید مناسب نہ سمجھی۔ سوال یہ ہے کہ اگر وہ جماعت اسلامی میں شمولیت پسند نہیں فرماتے تھے اور نہ وہ کبھی جماعت میں شامل ہوئے تو پھر آپ اپنے اس بیان کی کیا توجیہ فرماتے ہیں کہ "۱۹۴۳ء میں مولانا مودودی صاحب امیر جماعت اسلامی کے بلاوے پر مولانا اصلاحی صاحب گھرگھاٹ اور مدرستہ الاصلاح کی ملازمت سب چھوڑ کر دارالاسلام پٹھانکوٹ آ گئے اور ۱۹۴۳ء سے ۱۹۵۸ء تک جماعت اسلامی میں مولانا مودودی صاحب کے نائب کی حیثیت سے فرائض انجام دیتے رہے اور جنوری ۱۹۵۸ء میں انہوں نے جماعت اسلامی سے استعفیٰ دے کر اس سے علیحدگی اختیار فرمائی"۔

جہاں تک مولانا مودودی صاحب کے بارے میں اصلاحی صاحب کے تاثرات و جذبات کا تعلق ہے ان کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ مارچ ۱۹۵۳ء کے مارشل لاء کے تحت مولانا مودودی اور مولانا اصلاحی صاحب سمیت جماعت کے پچاس ساٹھ نمایاں ارکان گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیے گئے۔ مولانا مودودی' مولانا اصلاحی' ملک نصر اللہ خان عزیز' چوہدری محمد اکبر سیالکوٹی' سید نقی علی اور میں (طفیل محمد) لاہور سنٹرل جیل کے دیوانی وارڈ میں نظر بند تھے۔ وہیں مئی ۱۹۵۳ء میں مارشل لاء کے تحت فوجی عدالت میں مولانا مودودی صاحب' ملک نصر اللہ خان عزیز اور سید نقی علی صاحب پر مقدمہ چلا اور تین روز کی کارروائی کے بعد مولانا مودودی صاحب کو سزائے موت اور سات سال قید بامشقت اور سید نقی علی صاحب کو نو سال قید بامشقت اور ملک نصر اللہ خان عزیز صاحب کو تین سال قید بامشقت کی سزا سنا دی گئی۔ مولانا مودودی کو دیوانی گھر سے پھانسی کی کوٹھڑی میں منتقل کر دیا گیا۔ پھانسی کی کوٹھڑی میں ان کو پھانسی کے قیدیوں

کا لباس پہنا دیا گیا اور ان کی قمیض' پاجامہ اور جوتا اور ٹوپی وہاں سے واپس ہمارے پاس دیوانی گھر بھجوا دیے گئے تو ان چیزوں کو پاتے ہی مولانا اصلاحی صاحب فرط جذبات میں مولانا مودودی صاحب کی ٹوپی اور یہ کپڑے کبھی آنکھوں سے لگاتے' کبھی اپنے سر پر رکھتے اور کبھی سینے سے لگاتے' زارو قطار روتے اور فرماتے جاتے کہ میں مودودی صاحب کو بہت بڑا آدمی سمجھتا تھا' لیکن مجھے یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ خدا کا اس قدر مقبول اور مقرب بندہ ہے- نیز مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کے مولانا مودودی صاحب اور جماعت اسلامی کے بارے میں احساسات و جذبات کا اندازہ ان مضامین سے بھی کیا جا سکتا ہے جو اسی مضمون میں آپ کے اپنے الفاظ میں اس طرح درج ہے کہ "جماعت کے لیے ان کی فدویت کا یہ عالم رہا کہ جدھر سے بھی جماعت کو نشانہ بنایا گیا' مولانا (اصلاحی صاحب) دفاع کے لیے سینہ سپر ہو گئے- ان کے (ان) تمام تنقیدی مضامین کا مجموعہ "تنقیدات" کے نام سے شائع ہوا- آپ کے اپنے الفاظ میں' حد یہ ہے کہ "جب مولانا نعمانی نے جماعت اسلامی کے خلاف لکھا تو مولانا (اصلاحی صاحب) ہی نے اپنے اس عزیز دوست کے خلاف مورچہ لگایا"-

مزید بر آں' جب ۷-۱۹۵۶ء میں مجلس شوریٰ کی قائم کردہ جائزہ کمیٹی اور اس کی کارروائیوں سے پیدا شدہ صورت حال سے تنگ آ کر مولانا مودودی صاحب نے امارت جماعت سے استعفیٰ دے دیا کہ آئندہ وہ صرف ایک عام کارکن جماعت کی حیثیت سے ہی کام کریں گے اور اس معاملے کو سلجھانے کے لیے ماچھی گوٹھ میں جماعت کے ارکان کا کل پاکستان اجتماع عام منعقد ہوا اور اس میں بھی مولانا مودودی نے اپنے اسی موقف پر اصرار کیا تو مولانا امین احسن اصلاحی صاحب نے اس قدر موثر اور زور دار تقریر کی اور اس میں مولانا مودودی صاحب کو جھنجوڑتے ہوئے فرمایا کہ "آپ ہم لوگوں کو اپنے گرد جمع کر کے اب بھاگ کر کہاں جاتے ہیں- ہم آپ کو ہرگز نہیں چھوڑیں گے نہ بھاگنے دیں گے- اپنی یہ ذمہ داری آپ ہی کو سنبھالنی پڑے گی" تو اجتماع کی فضا ہی بدل گئی- نو سو پینتیس (۹۳۵) حاضر ارکان جماعت میں سے صرف پندرہ مولانا مودودی سے غیر مطمئن رہ گئے اور انہوں نے جماعت سے علیحدگی اختیار کر لی اور باقی نو سو بیس ارکان اور مولانا اصلاحی صاحب نے مولانا مودودی صاحب کو اپنا استعفیٰ واپس لینے پر مجبور کر دیا اور اس طرح جماعت کا یہ بحران ختم ہو گیا-

ماچھی گوٹھ کے اجتماع کے بعد مجلس شوریٰ نے جماعت کے دستور میں جو ترامیم کیں وہ مولانا امین اصلاحی صاحب سمیت ماچھی گوٹھ کے اجتماع میں شریک نو سو بیس ارکان کی بالاتفاق تجویز کردہ ہیں اور جماعت کا یہ دستور اس وقت بھی جماعت کا دستور ہے- اسے دیکھ کر آپ بتا دیجئے کہ اس میں امیر جماعت یا کسی دوسرے ذمہ دار جماعت کو آمرانہ اختیارات دینے والی دفعہ یا شق کونسی ہے- امیر' مجلس شوریٰ اور ہر عہدیدار کے فرائض و اختیارات اس میں واضح طور پر ثبت ہیں- امیر کو ارکان جماعت مجرد اکثریت سے



منتخب کرتے ہیں- اس کے فرائض اور اختیارات دستور میں درج ہیں- امیر کو مجلس شوریٰ دو تہائی اکثریت سے معزول کر سکتی ہے- جماعت کی پالیسی اور سارے اہم فیصلے مجلس شوریٰ طے کرتی ہے- جماعت کی دعوت اس کے امیر کی طرف نہیں' اس کے نصب العین اور کلیتہ اقامت دین کی طرف ہے- جماعت میں داخلہ اور اس سے اخراج کی شرائط واضح طور پر دستور میں ثبت ہیں-

مولانا امین احسن اصلاحی صاحب نے جماعت اسلامی سے استعفیٰ ماچھی گوٹھ میں مولانا مودودی صاحب اور جماعت سے اختلاف کرنے والے لوگوں سے اتفاق کرتے ہوئے نہیں دیا بلکہ انہوں نے ان لوگوں کے خلاف مولانا مودودی صاحب کا ساتھ دیا اور استعفیٰ انہوں نے اجتماع ماچھی گوٹھ کے ایک سال بعد جنوری ۱۹۵۸ء میں جائزہ کمیٹی کے چار ارکان کے خلاف مولانا مودودی صاحب کے تادیبی ایکشن سے اختلاف کرتے ہوئے دیا تھا- جماعت کے کسی دوسرے رکن نے ان کے اس اقدام میں ان کا ساتھ نہیں دیا- حتیٰ کہ ان کی اہلیہ محترمہ نے بھی ان کی تائید نہیں کی- وہ اپنے آخری سانس تک جماعت کی رکن اور اس کی کارکن رہیں-

رہی یہ بات کہ مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کی ماچھی گوٹھ والی تقریر کو مرتب کر کے شائع نہیں کیا گیا تو اس بارے میں واضح ہو کہ ماچھی گوٹھ کے اجتماع کی تقاریر ڈیڑھ دو گھنٹے سے چھ چھ سات سات گھنٹوں کی تھیں- اس زمانے میں نہ ٹیپ ریکارڈر تھے اور نہ ہمارے پاس کوئی شارٹ ہینڈ نویس تھا- میں ہی تقاریر کے نوٹ لیتا تھا- لیکن اتنی زیادہ اور اس قدر طویل تقاریر کو نوٹ کرنا میرے بس میں نہیں تھا- چنانچہ مولانا مودودی صاحب کی تقریر جو "جماعت اسلامی کا آئندہ لائحہ عمل" کے نام سے شائع شدہ موجود ہے' اس کے سوا کوئی اور تقریر شائع نہیں ہوئی- نہ جماعت کی طرف سے قلم بند کی جا سکی نہ شائع ہوئی- مولانا مودودی صاحب کی یہ تقریر ان کی اپنی مرتب کردہ ہے' کسی اور نے اسے مرتب نہیں کیا ہے- اگر مولانا اصلاحی صاحب اپنی تقریر قلمبند فرما دیتے تو اسے بھی شائع کیا جا سکتا تھا-

رہی مولانا اصلاحی صاحب سے آپ کی منسوب کردہ یہ بات کہ مولانا مودودی صاحب شوریٰ کو کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے تو اس بات کی گواہی تو مجلس شوریٰ کا ہر رکن دے گا کہ مولانا مودودی صاحب کا تو یہ مستقل طریقہ تھا کہ وہ بعض اوقات کئی روز تک اس لیے بحث کو چلاتے کہ سب یا مجلس شوریٰ کی بڑی اکثریت ایک نقطہ نظر پر متفق ہو جائے- مولانا مودودی صاحب ہمیشہ مجلس شوریٰ میں اتفاق رائے (Consensus) سے فیصلہ کرنے کی کوشش کرتے تھے-

آپ نے اپنے اس مضمون میں یہ بھی فرمایا کہ "قیام پاکستان کے بعد مولانا مودودی صاحب کی سوچ میں بنیادی تبدیلی پیدا ہوئی- وہ سمجھتے تھے کہ مسلم لیگ کی ذمہ داری پاکستان بنانا تھا- اس کو چلانے کی اہلیت اس کے پاس نہیں ہے اور ایک اسلامی ریاست کو چلانے کے لیے مطلوبہ صفات کے حامل افراد جماعت

اسلامی کے پاس ہیں۔ لہٰذا اب اقتدار جماعت کو ملنا چاہیے۔ پاکستان کے عوام دل و جان سے اسلام کے نفاذ کے خواہش مند ہیں۔ لہٰذا جماعت کے بر سر اقتدار آنے میں اب کوئی رکاوٹ موجود نہیں ہے۔ آپ کا کہنا ہے کہ اسی لیے جماعت نے انتخابات میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا بلکہ جماعت کے لوگوں نے آپس میں وزارتیں تقسیم کرنے کے منصوبے بھی بنانے شروع کر دیے"۔ محترم خالد مسعود صاحب! یہ سب باتیں سراسر القاء شیطانی ہیں۔ ایسی کوئی بات نہ کبھی مولانا مودودی صاحب کے دل و دماغ میں آئی اور نہ ان کے کسی ذی ہوش ساتھی کے دل و دماغ میں آئی۔ فروری' مارچ ۱۹۴۷ء میں جب انڈین نیشنل کانگرس کی متحدہ قومیت اور مسلم لیگ کی مسلم قومیت کے مابین ٹکراؤ کے نتیجے میں تقسیم ہند اور قیام پاکستان کی صورت واضح ہو کر سامنے آگئی تو جماعت اسلامی نے ۱۱' ۱۲ اپریل ۱۹۴۷ کو مغربی اور وسط ہند میں اپنی شاخوں کا اجتماع عام ٹونک میں اور ۲۶' ۲۷ اپریل ۱۹۴۷ء کو جنوبی ہند میں اپنی شاخوں کا اجتماع عام مدراس میں منعقد کر کے تقسیم ہند کے بعد بھارت میں رہ جانے والے مسلمانوں کو مولانا مودودی صاحب نے تفصیل سے بتایا کہ تقسیم کے بعد بھارت میں رہ جانے والے مسلمانوں کو کن حالات سے سابقہ پیش آنے والا ہے اور یہ بھی وضاحت سے بتایا کہ اپنے اور اپنے دین کے تحفظ و بقاء اور استحکام کے لیے انہیں کیا کیا اور کس طرح کرنا چاہیے (ملاحظہ ہو تحریک آزادی ہند اور مسلمان حصہ دوم صفحہ ۲۶۱ تا ۲۸۷) اور شمالی ہند (پنجاب' سرحد' سندھ اور بلوچستان) میں قائم جماعتوں کے ارکان کا اجتماع عام ۹ مئی ۱۹۴۷ء کو دار الاسلام پٹھانکوٹ میں منعقد کر کے انہیں بتایا کہ جماعت اسلامی کو پاکستانی علاقوں میں کیا کام کرنا ہے۔ اس بارے میں مولانا مودودی صاحب نے مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا۔

"مسلمانوں سے میں صاف صاف کہتا ہوں کہ موجودہ زمانے کی بے دین قومی جمہوریت (سیکولر نیشنل ڈیموکریسی) تمہارے دین و ایمان کے قطعاً خلاف ہے۔ تم اگر اس کے آگے سر تسلیم خم کرو گے تو قرآن سے پیٹھ پھیرو گے۔ اس کے قیام و بقا میں حصہ لو گے تو اپنے رسول ﷺ سے غداری کرو گے اور اس کا جھنڈا اٹھانے کے لیے اٹھو گے تو اپنے خدا کے خلاف علم بغاوت بلند کرو گے۔ جس اسلام کے نام پر تم اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہو اس کی روح اس ناپاک نظام کی روح' اس کے بنیادی اصول اس کے بنیادی اصولوں سے اور اس کا ہر جز اس کے ہر جز سے بر سر جنگ ہے۔ اسلام اور یہ نظام ایک دوسرے سے کہیں بھی مصالحت نہیں کرتے۔ جہاں یہ نظام بر سر اقتدار ہو گا وہاں اسلام نقش بر آب رہے گا اور جہاں اسلام بر سر اقتدار ہو گا وہاں اس نظام کے لیے کوئی جگہ نہ ہو گی۔ تم اگر واقعی اسی اسلام پر ایمان رکھتے ہو جسے قرآن اور محمد ﷺ لائے تھے تو تمہارا فرض ہے کہ جہاں بھی تم ہو اس قوم پرستانہ لادین جمہوریت کی مزاحمت کرو اور اس کے مقابلے میں خدا پرستانہ انسانی خلافت قائم کرنے کے لیے جدوجہد کرو۔ خصوصیت کے ساتھ جہاں تم بحیثیت قوم بر سر اقتدار ہو وہاں تو تمہارے اپنے ہاتھوں سے اسلام کے اصلی نظام کے



بجائے کافرانہ نظام بنے اور چلے تو حیف ہے تمہاری اس جھوٹی مسلمانی پر۔ رہے غیر مسلم حضرات (یاد رہے کہ جماعت اسلامی اپنے اجتماعات عام میں ہندوؤں' سکھوں اور عیسائیوں کو بھی شرکت کی دعوت دیتی تھی تاکہ وہ اسلام کی باتیں سنیں اور جماعت کی دعوت کو سمجھیں۔ چنانچہ اس اجتماع میں بھی ہندو مسلم کشیدگی کے باوجود ہندوؤں اور سکھوں کی کافی تعداد موجود تھی) تو ان سے میری خیر خواہانہ گزارش ہے کہ براہ کرم اصول کے معاملے میں ان تعصبات کے قفل اپنے دلوں پر نہ چڑھائیے جو پچھلی تاریخ اور آج کی قومی کشمکش کی وجہ سے آپ کے اور ہمارے درمیان پیدا ہو گئے ہیں۔ اصول کسی قوم کی آبائی جائیداد نہیں ہوتے' نہ ان پر کسی قومیت کا ٹھپہ لگا ہوا ہوتا ہے۔ وہ اگر صحیح اور مفید ہیں تو سب انسانوں کے لیے صحیح اور مفید ہیں اور اگر غلط ہیں تو سب ہی کے لیے غلط ہیں۔ آپ صحیح اصول اختیار کریں گے تو اپنا بھلا کریں گے۔ کسی پر کوئی احسان نہیں کریں گے۔ غلط اصولوں کی پیروی کریں گے تو اپنا نقصان کریں گے کسی کا کچھ نہیں بگاڑیں گے"۔

تقسیم کے بعد پاکستان میں جماعت کے پروگرام کی وضاحت کرتے ہوئے مولانا مودودی صاحب نے فرمایا کہ "اب یہ بات تقریباً طے ہے کہ ملک تقسیم ہو جائے۔ ایک حصہ مسلمان اکثریت کے سپرد کیا جائے اور دوسرا حصہ غیر مسلم اکثریت کے زیر اثر ہو گا۔ پہلے حصے میں ہم کوشش کریں گے کہ رائے عامہ کو ہموار کر کے اس دستور و قانون پر ریاست کی بنیاد رکھیں جسے ہم مسلمان خدائی دستور و قانون کہتے ہیں۔ غیر مسلم حضرات وہاں ہماری مخالفت کرنے کے بجائے ہمیں وہاں کام کرنے کا موقع دیں اور دیکھیں کہ ایک بے دین قومی جمہوریت کے مقابلے میں یہ خدا پرست جمہوری خلافت جو محمد ﷺ کی لائی ہوئی ہدایت پر قائم ہو گی کہاں تک باشندگان پاکستان کے لیے اور کہاں تک تمام دنیا کے لیے رحمت و برکت ثابت ہوتی ہے"۔

چنانچہ پاکستان آکر اپنی ساری قوت اور وسائل جماعت اسلامی نے یہاں محمد ﷺ کی لائی ہوئی ہدایت کے مطابق اسلامی جمہوری اور فلاحی ریاست کے قیام کے لیے وقف کر دی۔ جنوری ۱۹۴۸ء میں اسلامی نظام کے قیام اور اس سلسلے میں قدم اول کے طور پر قرار داد مقاصد کے لیے ملک گیر اور مارچ ۱۹۴۹ء میں قرار داد مقاصد پاس ہو جانے کے بعد اس کے مطابق اسلامی دستور کی تدوین کے لیے پے در پے مہمات برپا کیں جن کے نتیجے میں ۱۹۵۴ء کا دستور' اس کے خاتمہ کے بعد ۱۹۵۶ء کا دستور' اس کے مارشل لاء کی نذر ہو جانے کے بعد جنرل ایوب کے آمرانہ دستور کو پارلیمانی جمہوری بنوانے کے لئے اس کی منسوخی کے بعد ۱۹۷۳ کا دستور بنوایا جو آخر کار اب ۱۹۸۵ کے اسلامی جمہوریہ پاکستان کے دستور کی صورت میں ملک کا دستور ہے۔ انتخابات میں حصہ بھی اسی جدوجہد کا حصہ رہا اس لیے کہ انتخابی جدوجہد رائے عامہ کو ہموار کرنے کا سب سے موثر ذریعہ ہے۔ اس کے دوران عوام ہر ایک کی بات کو توجہ سے

سننے کے موڈ میں ہوتے ہیں۔ مولانا مودودی صاحب جیسا حکیم و مدبر رہنما تو درکنار جماعت اسلامی کا کوئی عام کارکن بھی کبھی اس غلط فہمی کا شکار نہیں ہوا کہ پاکستان کی حکومت اور اقتدار جماعت کی جھولی میں گرنے والے ہیں۔ جماعت اسلامی انتخابات اور انتخابی جدوجہد کو اپنی بات عوام تک پہنچانے اور سمجھانے کا موسم بہار سمجھتی ہے اور اسمبلیوں میں نشستوں کو بھی اسی کام کے لیے استعمال کرتی ہے۔ اپنے پیش نظر نصب العین کے حصول کے لیے جماعت کا مستقل طریقہ کار اس کے دستور کی دفعہ ۵ ملاحظہ فرمائیے۔

امید ہے اور اس بارے میں آپ سے میری یہ گزارش ہے کہ آپ میرے اس مراسلہ کو "تدبر" کے اگلے شمارہ میں شائع فرما دیں تاکہ قارئین تدبر کے سامنے بھی صحیح صورت حال آجائے اور وہ مولانا مودودی اور مولانا اصلاحی صاحب کے بارے میں کسی غلط تاثر میں مبتلا نہ رہیں۔ والسلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

والسلام

خاکسار

طفیل محمد

منصورہ۔ لاہور

---

تدبر میں مولانا پر آپ کا مضمون بہت شاندار اور پر اثر ہے۔ اس سے مولانا کی شخصیت کے بعض ان پہلوؤں پر روشنی پڑی ہے جن سے اکثر حضرات ناواقف تھے۔ دو باتوں کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں:

ا۔ جماعت اسلامی میں مولانا کی شمولیت کا واقعہ نہایت مجمل انداز سے بیان ہوا ہے۔ مولانا کی یہ بات کہ وہ مولانا مودودی صاحب کو محض انشاء پرداز سمجھتے تھے لوگوں کے لیے تعجب اور اعتراض کا باعث بنی ہے۔ آپ کے علم میں ہو گا کہ جب میثاق میں مولانا کا یہ قول نقل ہوا تھا کہ لا فرق بینہ وبین پرویز تو اس پر بھی کچھ لے دے ہوئی تھی۔ اصل میں لوگوں کو اعتراض یا تعجب اس امر پر ہوتا ہے کہ مولانا اصلاحی مولانا مودودی کو کچھ سمجھتے بھی نہیں تھے اور پھر سترہ سال تک ان کی امارت کے تحت کام بھی کرتے رہے اور علماء کے حلقے میں ان کا دفاع بھی کرتے رہے۔

اس ضمن میں مجھے بار بار یہ خیال آتا رہا کہ وہ انٹرویو جو میں نے مولانا سے جماعت اسلامی کے بارے میں لیا تھا اس میں کسی قدر ان سوالات کا جواب موجود ہے۔ تاہم اب کوئی دس بارہ سال سے اوپر اس انٹرویو کو لیے ہوئے ہو گئے ہیں مگر وہ اب تک شائع ہی نہیں ہوا۔ (یہ انٹرویو ڈاکٹر



صاحب کے شکریہ کے ساتھ شامل اشاعت کیا جا رہا ہے۔ مدیر)

۲۔ آپ کے مضمون کے سلسلہ میں دوسری بات حافظ کے کلام سے فال نکالنے کے بارے میں ہے۔ ہم نے سنا تو یہی ہے کہ اس طرح سے فال نکالنا صحیح نہیں ہے۔ لیکن کچھ حتمی طور پر معلوم نہیں ہے۔ مفتی محمد شفیع صاحب نے اپنی تفسیر میں اس کے ناجائز ہونے کا فتوی دیا ہے۔ مجھے خیال ہوتا ہے کہ ممکن ہے استخارہ کی ایک صورت کے طور پر علماء نے اسے جائز سمجھا ہو۔

والسلام

منصور الحمید۔ دمام

---

تدبر قرآن کی تلخیص جو آپ کر رہے ہیں اس کی تکمیل اور اشاعت یقیناً ایک کارنامہ ہو گی۔ بخاری شریف اور موطا امام مالک پر جو کام مولانا مرحوم کر گئے ہیں' اس کو کتابی شکل میں الگ الگ چھاپنا ایک ضروری امر ہے۔

مولانا مرحوم و مغفور کے جو حالات آپ نے تدبر میں لکھے ہیں وہ سب میں نے پڑھ لیے ہیں۔ ان میں ایک چیز دل کو کھٹکی کہ دیوان حافظ کی فال کا ذکر آپ نے کیوں کر دیا۔ مولانا تو ان صوفیاء کے سخت مخالف تھے۔ اگر اوائل عمر میں کوئی واقعہ کبھی ایسا گزر چکا تھا تو اس کا ذکر ناگزیر تو نہ تھا۔ بلکہ مولانا علیہ الرحمہ کے قرآنی فکر کے سراسر مخالف تھا۔ مولانا تو دیوان حافظ کو صرف دل بہلانے کے لیے کبھی کبھار پڑھ لیا کرتے تھے۔ وہ اسے کوئی معقول کتاب کب مانتے تھے۔ کبھی کوئی واقعہ بطور تفنن طبع اور وہ بھی اوائل عمر کا اگر ہو تو بھی ناقابل اشاعت تھا۔

آپ کا بھائی

خوشی محمد کھر کلاں

---

# روداد تعزیتی اجلاس

## منعقدہ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر ۱۶ دسمبر 1997ء بمطابق ۱۵ شعبان ۱۴۱۸ھ

یہ خبر کہ مدرسۃ الاصلاح کے گل سرسبد معروف مفسر قرآن' ترجمان فراہی' جناب مولانا امین احسن اصلاحی طویل علالت کے بعد کل ۱۴/ شعبان ۱۴۱۸ھ وقت سحر اس عالم فانی سے عالم جاودانی کو سدھار گئے صحن مدرسۃ الاصلاح میں بجلی بن کر گری جس سے مدرسہ کے چپہ چپہ پر غم و الم کی دبیز کہر چھا گئی۔ سالانہ امتحان اور دوسری تمام مصروفیات یک لخت ملتوی کر دی گئیں اور مدرسہ کی وسیع مسجد میں اساتذہ' طلبہ اور ذمہ داران جمع ہوئے' مولانا کی عظیم علمی و قرآنی خدمات کو یاد کیا' انھیں خراج تحسین پیش کیا' اپنے رنج و غم کا اظہار کیا اور حسب ذیل قرارداد منظور کی:

- مدرسۃ الاصلاح کے اساتذہ و طلبہ کا یہ اجلاس مدرسہ کے اس عظیم فرزند اور فقید المثال مفسر قرآن' جانشین فراہی" مولانا امین احسن اصلاحی کی وفات حسرت آیات پر اپنے شدید رنج و غم کا اظہار کرتا ہے۔
- یہ اجلاس کھلے دل سے اعتراف کرتا ہے کہ مولانا مرحوم مدرسۃ الاصلاح کے لئے سرمایہ افتخار تھے اور ہیں۔ قحط الرجال کے اس دور میں مولانا مرحوم نے فکر فراہی کی روشنی میں علمی' قرآنی' فکری' تحقیقی' تصنیفی' دعوتی' تحریکی' تعلیمی اور سیاسی میدان میں جو بے مثال خدمات انجام دی ہیں اور ایک خاص نہج عطا کیا ہے وہ ملت اسلامیہ کے لیے نہ صرف قیمتی متاع اور قابل قدر سرمایہ ہے بلکہ ایک ایسا منارۂ نور ہے جس سے ملت اسلامیہ کے اہل علم و فکر صدیوں کسب نور اور اخذ و استفادہ کرتے رہیں گے۔
- مولانا مرحوم آسمان علم و تحقیق کے آفتاب و ماہتاب تھے۔ ان کی وفات سے علمی دنیا پر تاریکی سی چھا گئی ہے اس لئے مولانا کا سانحہ ارتحال نہ صرف مدرسۃ الاصلاح بلکہ عالم اسلام کا ناقابل تلافی نقصان اور عظیم حادثہ ہے۔
- یہ اجلاس بارگاہ خداوندی میں اشکبار آنکھوں اور لرزتے ہاتھوں کے ساتھ دعاگو ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کی عظیم خدمات کو شرف قبولیت سے نوازے۔ ان کی مغفرت فرمائے۔ انھیں اعلیٰ علیین میں شہداء و صدیقین کی صف میں جگہ دے۔ ان کی وفات سے ملت اسلامیہ کا جو عظیم خسارہ ہوا ہے اس کی تلافی کی سبیل پیدا کرے اور پسماندگان کو صبر جمیل کی توفیق بخشے۔ آمین!

منجانب

اساتذہ و کارکنان و طلبہ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر



## منعقدہ ادارہ علوم القرآن سرسید نگر علی گڑھ

ادارہ علوم القرآن (سرسید نگر' علی گڑھ بھارت) کے زیر اہتمام ۱۸/ دسمبر کو ایک تعزیتی نشست زیر صدارت پروفیسر اشتیاق احمد صاحب (مولانا امین احسن اصلاحی کے بھتیجے) منعقد ہوئی جس میں ادارہ کے متعلقین کے علاوہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے متعدد اساتذہ و طلبہ شریک ہوئے۔ تلاوت کلام پاک کے بعد ڈاکٹر ظفر الاسلام اصلاحی ریڈر شعبہ اسلامیات علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے ابتدائی کلمات کے طور پر مولانا امین احسن اصلاحی رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی پر روشنی ڈالی اور ان کی قرآنی خدمات کا جائزہ لیا۔ آپ نے فرمایا "مولانا کا انتقال نہ صرف ان کے اعزہ و اقربا' متعلقین مدرسۃ الاصلاح اور وابستگان تحریک اسلامی کے لئے بلکہ پوری ملت اسلامیہ کے لیے ایک عظیم سانحہ ہے۔ مولانا نے پورے ۷۵ سال تک قرآنی علوم اور تحریک اسلامی کی جو عظیم خدمت انجام دی ہے وہ ان ہی کا حصہ ہے۔ مولانا فراہی" کے انتقال کے بعد ان کے تشکیل کردہ خطوط پر مولانا مدرسہ کی ترقی کے لئے کوشاں رہے' درس و تدریس کے ساتھ ساتھ اس فکر کی توسیع و اشاعت کے لیے تمام ممکنہ ذرائع استعمال کیے۔ مولانا فراہی" کے تفسیری اجزاء کے ترجمہ' الاصلاح کی ادارت' دائرہ حمیدیہ کی علمی سرگرمیوں' تحریک اسلامی کی قیادت اور اس کے علاوہ بھی مولانا نے بہت سی علمی و دینی خدمات انجام دیں۔ قرآن مجید' حدیث' فقہ' تاریخ اسلامی' اسلامی ریاست' اور ان کے علاوہ دوسرے موضوعات پر متعدد کتابیں لکھیں۔ درس و تدریس' مذاکرہ و مباحثہ' تحقیق و تصنیف' غرض کہ ہر ممکن ذریعہ سے قرآنی فکر کو عام کرنے کی کوشش کی۔ واقعہ یہ ہے کہ قرآن سے وابستگی' قرآنی علوم سے لگاؤ' قرآنی فکر کو پروان چڑھانے کا بے پناہ جذبہ مولانا کی ذات کا خاصہ تھا۔ ان کی یہ قرآنی خدمات ہمارے لیے مشعل راہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ ڈاکٹر ابو سفیان اصلاحی لیکچرر شعبہ عربی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ' جنھوں نے متعدد بار پاکستان کا سفر کیا ہے اور مولانا سے ملاقات و گفتگو کا شرف بھی ان کو حاصل رہا ہے اور اس بنا پر یہ بات فطری ہے کہ ان کے اوپر اس سانحہ کا اثر زیادہ تھا' کچھ زیادہ گفتگو نہ کر سکے البتہ آپ نے مولانا سے اپنی ملاقاتوں کے حوالہ سے چند واقعات کا بطور خاص ذکر کیا جن سے مولانا کی وسیع الجہات شخصیت کے کئی نمایاں گوشے ابھر کر سامنے آئے۔ آپ نے کہا کہ آخر وقت میں مولانا مرحوم اپنے وطن اعظم گڑھ آنے کے لیے بہت مضطرب اور بے چین رہا کرتے اور مدرسۃ الاصلاح آنے کا ہر وقت خواب دیکھا کرتے تھے۔ مولانا کی خواہش تھی کہ وہ کسی طرح مدرسۃ الاصلاح پہنچ جائیں۔ مدرسہ اور متعلقین مدرسہ کا ذکر ہوتا تو مولانا آبدیدہ ہو جاتے۔ ڈاکٹر عبد العظیم اصلاحی ریڈر شعبہ معاشیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ مجھے صرف دو عظیم شخصیتوں سے ملنے کی خواہش تھی۔ ایک مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی" اور دوسرے مولانا امین احسن اصلاحی" کی ذات گرامی تھی۔ مولانا مودودی" سے ملنے پاکستان جانا ہوا مگر اس وقت وہ بیمار تھے اور ان سے ملنے کی اجازت نہ تھی۔ البتہ دوسرے سفر میں مولانا امین احسن اصلاحی سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا' مگر اس وقت جب مولانا بالکل

معذور ہو چکے تھے۔ مولاناؒ نے پاکستان میں قرآن فہمی اور فکر فراہی کا ایک بڑا حلقہ قائم کیا ہے اور متعدد ادارے اس فکر کو پروان چڑھانے کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔

ڈاکٹر اشتیاق احمد ریڈر شعبہ تاریخ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ' صدر ادارہ علوم القرآن اور مدیر مجلہ علوم القرآن نے بھی مولانا کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ آپ نے فرمایا آج ہمارے سر سے ایک سایہ تھا جو اٹھ گیا۔ ہم اپنے آپ کو بے سہارا محسوس کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ مدرسۃ الاصلاح کو ایک علمی مرکز کی حیثیت دینا' وہاں علمی مزاج پیدا کرنا' باصلاحیت شاگردوں کا ایک حلقہ قائم کرنا جو اس فکر اور اس کام کو آگے بڑھانے کی صلاحیت رکھتے تھے' مولاناؒ کا ناقابل فراموش کارنامہ ہے۔ اس کے علاوہ مولانا اپنے زمانہ کے زبردست خطیب و مقرر تھے۔ مدرسۃ الاصلاح کے اطراف میں اصلاح معاشرہ کی جو تحریک چل رہی تھی اس میں مولانا کا بہت بڑا حصہ رہا ہے۔ مولانا سلطان احمد اصلاحی رکن ادارہ تحقیق و تصنیف اسلامی علی گڑھ نے فرمایا کہ مولاناؒ نے قرآنی علوم کی یکہ و تنہا جو عظیم خدمت انجام دی ہے وہ ایک شخص کا نہیں' ایک اکیڈمی کا کام ہے۔ مولانا کا کام بہت ہی منظم اور اوریجنل ہے۔ مولانا ایک عظیم مفکر اور قائدانہ صلاحیتوں کے مالک تھے۔ مولانا کے کارنامے ہمہ جہتی ہیں۔ مترجم' مفسر' خطیب' ادب شناس ہونے کے علاوہ بے شمار دوسرے کمالات ان کی ذات میں جمع تھے۔ اللہ نے ان کو توفیق دی کہ انہوں نے تاحیات ان صلاحیتوں کو اللہ ہی کی راہ میں کھپا دیا۔ ان کا حق ہے کہ آئندہ ان کی شخصیت اور خدمات پر ریسرچ و تحقیق کا کام ہو اور ان کے منصوبوں کو آگے بڑھایا جائے جو ان کو زندگی بھر عزیز رہے۔ تدبر قرآن ان کی شاہکار تفسیر ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ مولانا نے تدبر قرآن کا کام ساٹھ سال کی عمر میں اس وقت شروع کیا جب کہ عام لوگ اس عمر میں تھک ہار کر بیٹھ جاتے ہیں۔ یہ مولانا ہی کا حوصلہ اور عزم تھا کہ اس کو مکمل کرکے اپنے استاد کا حق ادا کر دیا۔ انہوں نے عزوجاہ اور مالی منفعت سے بے نیاز ہو کر جو کارنامہ انجام دیا ہے وہ لائق تقلید اور قابل رشک ہے۔ اصلاحی برادری پر فرض ہے کہ اس کام کو آگے بڑھائے۔

پروفیسر محمد یسین مظہر صدیقی ندوی شعبہ اسلامیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ مولانا جیسی شخصیتیں خاندان' وطن' ادارے اور رشتوں ناتوں سے بالا ہوا کرتی ہیں۔ مولانا مرحوم پوری انسانیت اور پوری کائنات کی میراث ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی حالیہ ۳۰ اکتوبر ۹۷ء کی ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ مجھے فخر ہے کہ مولانا کی ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ آپ نے فرمایا کہ ستر برس سے زیادہ تصنیف و تالیف کا کام کرنا خود بہت بڑا کارنامہ ہے۔ پاکستان میں مولانا نے متعدد قرآنی حلقے قائم کیے اور پیغام ربانی کو ہر خاص و عام تک پہنچایا۔ پاکستان کے خواص و عوام ہر ایک مولانا کا عقیدت مند ہے۔ مولانا کے درس قرآن میں ہمیشہ شرکاء کی تعداد میں اضافہ ہی ہوتا رہا' جس کے ذریعہ سے انہوں نے کئی نسلوں کو متاثر کیا۔ اس موقع پر ڈاکٹر سکندر علی اصلاحی نے بھی اپنے احساسات و جذبات ظاہر کیے اور بالخصوص تحریک اسلامی کے حوالہ سے ان کی خدمات کے بعض پہلوؤں کو واضح کیا۔ آخر میں مولانا عمید الاسلام قاسمی صاحب نے جو مولانا مرحوم کے ایک گہرے معتقد ہیں' اپنی عقیدت کا اظہار کیا اور انہیں کی



دعا پر نشست کا اختتام ہوا۔ یہ نشست بعد عصر سے عشاء کے قریب تک چلی۔ درمیان میں مغرب کے لیے وقفہ رہا۔ ادارہ علوم القرآن کی جانب سے اس عزم کا اظہار کیا گیا کہ انشاء اللہ مولاناؒ کے مشن کو جاری و باقی رکھنے کی ہر ممکن کوشش کی جائے گی۔ علوم القرآن کا آئندہ شمارہ انشاء اللہ مولانا امین احسن اصلاحی نمبر کے طور پر شائع کیا جائے گا۔ صدر ادارہ نے یہ امید ظاہر کی کہ اہل علم' بالخصوص قرآنیات سے دلچسپی رکھنے والے' اس عظیم منصوبہ کی تکمیل میں اپنا تعاون پیش کریں گے۔

(ترتیب: اشہد رفیق ندوی' سکندر علی اصلاحی)

---

بقیہ صفحہ 44 سے آگے

فلاسفہ انسانی فطرت سے براہ راست تعرض نہیں کرتے جبکہ سقراط میں خاص بات یہ ہے کہ وہ انسانی فطرت کو براہ راست چھیڑتا ہے۔ پے در پے سوالات سے ہمارے اندر کی الجھنوں کو اتنا واضح کر دیتا ہے کہ انسان خود سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ تیسری بات یہ ہے کہ فلاسفہ معاشرہ سے ڈرتے بلکہ معاشرہ کے اسیر ہوتے ہیں۔ سقراط نہ معاشرہ سے ڈرتا ہے نہ معاشرہ کا اسیر ہے۔ اس کی زندگی کسی بادشاہ یا حکومت سے وابستہ نہیں رہی۔ اس کا سب سے الگ اپنا ہی ایک دائرہ ہے جس میں اسی جیسے کچھ لوگ ہیں۔ اس لیے وہ محض مفکر ہی نہیں ایک لیڈر بھی ہے۔

سقراط کی زندگی بے عیب ہے' اس کا اخلاق نہایت پاکیزہ ہے' علم اس کی باتوں سے برستا ہے' اس لیے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ وہ نبی رہا ہو۔ انبیاء جتنے بھی ہیں وہ سب کے سب قرآن مجید میں مذکور نہیں ہیں۔ سقراط میں وہ اوصاف پائے جاتے ہیں جو انبیاء میں ہوتے ہیں۔ انبیاء کا علم انسانی فطرت کے مطابق ہوتا ہے اور محسوس ہوتا ہے کہ براہ راست ہے۔ یہی حال سقراط کا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ سقراط کو پڑھنے کے ابتدائی دور ہی میں میری یہ رائے تھی کہ نبی ہونے کے لیے جن اوصاف کی ضرورت ہے وہ سب اس میں موجود ہیں۔ پھر جس زمانے اور جس ملک میں وہ پیدا ہوا اس میں اسی طرح کا آدمی نبی ہو سکتا تھا۔

تاریخ کی کسی قدیم شخصیت کو نبی ماننا یا نہ ماننا خدا کو ماننے یا نہ ماننے کے مترادف نہیں ہے۔ یہ کوئی عقیدے اور ایمان کا مسئلہ بھی نہیں ہے۔ نبی پر خدا کی وحی آتی ہے اور میرا خیال ہے کہ سقراط کے ضمن میں اس کے شواہد پائے جاتے ہیں۔ کم سے کم اتنی بات تو طے ہے کہ سقراط بہرحال ہے پڑھے جانے کی چیز۔ اس کے پاس علم بھی ہے' اخلاق بھی ہے اور کردار بھی۔ دنیا کو ایسے لوگوں کی ضرورت ہے۔ ان کے بارے میں کچھ لکھنا اور شائع کرنا درحقیقت دنیا پر احسان کرنا ہے"۔

---

سید اسحاق علی

# اشاریہ مضامین تدبر

(شمارہ نمبر 51 تا 60)


## تفسیری حواشی

| عنوان | مصنف | تدبر شمارہ نمبر |
| --- | --- | --- |
| سورہ بنی اسرائیل | خالد مسعود | 52,51 |
| سورہ کہف | خالد مسعود | 53 |
| سورہ مریم | خالد مسعود | 54 |
| سورہ طٰہٰ | خالد مسعود | 55 |
| سورہ انبیاء | خالد مسعود | 56 |
| سورہ حج | خالد مسعود | 57 |
| سورہ مومنون | خالد مسعود | 58 |
| سورہ نور | خالد مسعود | 59 |

## شرح حدیث

| | | |
| --- | --- | --- |
| صحیح بخاری۔ کتاب العلم | امین احسن اصلاحی / سعید احمد | 51 |
| صحیح بخاری۔ کتاب الوضوء | امین احسن اصلاحی / سید اسحاق علی | 52 تا 58 |
| موطاء۔ کتاب الحدود، کتاب الاشربہ | امین احسن اصلاحی / سعید احمد | 51 |
| موطاء۔ کتاب العقول | امین احسن اصلاحی / سعید احمد | 52 تا 54 |
| موطاء۔ کتاب الجامع | امین احسن اصلاحی / سعید احمد | 55 تا 59 |

## قومی و ملی مسائل

| | | |
| --- | --- | --- |
| دام ہم رنگ زمین | خالد مسعود | 51 |
| ترکی کے انتخابات | خالد مسعود | 52 |
| انقلاب آفریں ملکی انتخابات | محبوب سبحانی | 56 |
| مشاہدات حج | خالد مسعود | 57 |
| حکومت کی کارکردگی کے بعض اچھے پہلو | خالد مسعود | 58 |





## فراہی اصول تفسیر

| | | |
| --- | --- | --- |
| تلاش نظم کے لیے چند اہم اشارات | خالد مسعود | 53 - 52 |

## شخصیات

| | | |
| --- | --- | --- |
| مولانا بدرالدین اصلاحی | خالد مسعود | 54 |
| مولانا حکیم عبدالرحیم اشرف | خالد مسعود | 54 |
| مولانا امین احسن اصلاحی: | | |
| علم و عرفان کے ماہ کامل کا غروب | خالد مسعود | 59 |
| حکمت قرآن کا شارح | ضیاء الدین اصلاحی | 60 |
| جامع کمالات شخصیت | ڈاکٹر ظفر الاسلام اصلاحی | 60 |
| فکر قرآنی کا رازداں | سلیم کیلانی | 60 |
| دیدہ ور | محبوب سبحانی | 60 |
| جماعت اسلامی سے وصل و فصل کے اسباب | ڈاکٹر منصور الحمید | 60 |
| صاحب تدبر۔ چند خاطرات | زاہد منیر عامر | 60 |
| مولانا اصلاحی سے چند باتیں | ڈاکٹر ابو سفیان اصلاحی | 60 |
| ڈائری کے چند اوراق | عبدالرزاق | 60 |
| ہمہ صفت شخصیت | ڈاکٹر ابو سفیان اصلاحی | 60 |
| نابغہ روزگار محقق | جسٹس (ر) محمد افضل چیمہ | 60 |
| بیدار مغز عالم دین | عبدالرشید عراقی | 60 |
| متوازن و معتدل عالم | عبدالحمید براشیق | 60 |
| بحر ذخار کا غواص | عبدالخالق فاروقی | 60 |
| شفیق استاد | محمود احمد لودھی | 60 |
| فراہی اور مولانا اصلاحی | ڈاکٹر منصور الحمید | 60 |
| یادِ امین احسن اصلاحی (نظم) | ڈاکٹر شبیر بخاری | 60 |

## مراسلہ و مذاکرہ

| | | |
| --- | --- | --- |
| بعض وضاحتیں | میاں طفیل محمد، خوشی محمد<br>ڈاکٹر منصور الحمید | 60 |
| تعزیتی اجلاس | مدرسۃ الاصلاح، ادارہ علوم القرآن | 60 |

## تاریخ و سیرت


| | | |
|---|---|---|
| فتح مکہ کی تکمیل | خالد مسعود | 52-51 |
| غزوہ حنین | خالد مسعود | 53 |
| رسول اللہ کی دعوت کے مکی دور میں اہل کتاب کا کردار | خالد مسعود | 56-54 |
| مدینہ کو دارالہجرت بنانے کے اسباب و احوال | خالد مسعود | 58 |
| مواخات اور میثاق مدینہ | خالد مسعود | 59 |


## مقالات


| | | |
|---|---|---|
| انجیلوں میں آسمانی بادشاہت کا مفہوم | خالد مسعود | 54 |
| یہود کو نبی امی پر ایمان لانے کی دعوت | خالد مسعود | 55 |
| تذکرہ و تبصرہ | امین احسن اصلاحی | 60 |
| مولانا اختر احسن اصلاحی (مرحوم) | امین احسن اصلاحی | 60 |


## تبصرہ کتب


| | | |
|---|---|---|
| دینی صحافت | محبوب سبحانی | 53 |
| عالم اسلام کی اخلاقی صورت حال | محبوب سبحانی | 55 |
| حکمت قرآن | مولانا محمد فاروق خان | 56 |
| عالم اسلام کی صورت حال | محبوب سبحانی | 57 |
| عشر و زکوۃ میں توسیع کی ضرورت | سعید احمد | 57 |
| ام الکتاب میں اللہ کا تعارف | محمد یونس | 57 |
| مقدمہ ریاض القرآن | محمد یونس | 57 |
| اشاریہ مضامین تدبر (شمارہ 51 تا 60) | سید اسحاق علی | 60 |



## تالیفات امام حمید الدین فراہی

| | روپے پیسے |
|---|---|
| 1. [illegible] | 328 - 00 |
| 2. [illegible] | 84 - 00 |

## تالیفات مولانا امین احسن اصلاحی

| | |
|---|---|
| 1. [illegible] (... جلد) | 2,952 - 00 |
| [illegible] | 328 - 00 |
| 2. [illegible] | 105 - 00 |
| 3. [illegible] | 90 - 00 |
| 4. [illegible] توحید | 144 - 00 |
| 5. [illegible] | 54 - 00 |
| 6. [illegible] | 54 - 00 |
| 7. [illegible] دوم | 105 - 00 |
| 8. [illegible] کا طریق کار | 105 - 00 |
| 9. [illegible] تدوین | 78 - 00 |
| 10. [illegible] میں فقہی اختلافات کا حل | 78 - 00 |
| 11. [illegible] میں عورت کا مقام | 105 - 00 |
| 12. [illegible] کے احکام | 12 - 00 |
| 13. [illegible] مسائل۔ قرآن حکیم کی روشنی میں | 120 - 00 |
| 14. [illegible] | 90 - 00 |
| 15. [illegible] : جلد اول | 165 - 00 |

## فاران فاؤنڈیشن

122 - فیروز پور روڈ، اچھرہ، لاہور- 54600- پاکستان

فون - 7595200